شمارہ
۲۱
یکم ستمبر تا ۱۵/ستمبر ۲۰۲۶ء

پندرہ روزہ

آن لائن

اُردو گلبن (جدہ)

(خالص ادبی ومعاشرتی رسالہ)

ہم نے خوشبو کے بند کھول دیئے
اب ہوا تیری ذمہ داری ہے

مدیر اعلیٰ: مہتاب قدر

پندرہ روزہ

اُردو گلبن

(خالص ادبی ومعاشرتی رسالہ)

مجلس ادارت

پروفیسر ارتضیٰ کریم

مہتاب قدر

مرزا محمد نواب

افسر حسین

اسلم افغانی

تاشقین سیّد

فیصل طفیل

مجلس مشاورت

نعیم جاوید	(دمام الخبر)
افتخار راغب	(ریاض)
محمد سیف الدین	(ریاض)
ناصر برنی	(ینبع)
سراج وہاب	(جدہ)
افسر فہیم	(امریکہ)
دانش عبدالغفور	(ریاض)
مسعود حساس	(کویت)
عزیز الرب علیگ	(جدہ)
اعجاز شاہین	(امارات)

اشاعت کی شرائط

۱۔ مضمون زبان وبیان کے اعتبار سے مبہم اور پیچیدہ نہ ہو۔

۲۔ مضمون کا زیادہ تر مواد ماخوذ ومستفاد نہ ہو اور حوالے ساتھ نقل کیے جائیں۔

۳۔ مضمون میں موضوع سے متعلق کماحقہ احاطہ کیا گیا ہو۔

۴۔ اقتباسات/ اشعار ضرورت سے زیادہ نہ ہوں، مضمون نگار کی اپنی تحریر زیادہ ہو۔

۵۔ مضمون رسالہ کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو؛ یعنی تحریر سے کسی کی دل آزاری یا ہجو مقصود نہ ہو ۔

۶۔ مضمون میں ترجیحاً کوئی نیا زاویہ یا نئی جہت ہونی چاہیے۔

۷۔ مضمون نہایت مختصر یا بہت طویل نہ ہو۔

۸۔ مضمون نگار اپنی پاسپورٹ سائز تصویر، پورا پتہ، اور مراسلت کے لیے ای میل وفون نمبر بھی ارسال فرمائیں۔

مہتاب قدر
مدیر اعلیٰ
Email: mahtabqadr@gmail.com
Whatsapp: +966 50 132 9193

مرزا محمد نواب
Email: mirza_shanov@hotmail.com
Whatsapp: +966 50 8509457

تزئین کار محمد سلیمان طاہر

توجہ طلب: پندرہ روزہ آن لائن اُردو گلبن رسالے میں شائع ہونے والے تمام مضامین قلم کاروں کے اپنے ذاتی خیالات ہیں اور وہ خود ان کے ذمہ دار، کسی بھی تحریر سے کسی کی تضحیک یا ہجو منظور نہیں اور یہ مطلق ضروری نہیں کہ ادارہ اُردو گلبن قلم کاروں کی نگارشات سے اتفاق کرے۔

حُسنِ ترتیب

عنوان	مصنف	صفحہ
قرآنی آیت		4
حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)		4
اداریہ: ''قومی معدہ اور اُردو کا مظلوم مجلہ''	نعیم جاوید	5
حمدِ رب کریم ''حمد کرتا ہوا بہ چشمِ نم''	اطہر عباسی (جدہ)	7
تحفۂ اہلِ حرم	محسن حبیب (دوحہ۔قطر)	7
دُعا ''اے رب! تُو مجھے اپنی محبت سے نوازے''	شمیمہ فاروقی شمع (جدہ)	8
نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ''لیا میں نے جب ان کا نام اللہ اللہ''	شاد اعظمی ندوی (اعظم گڑھ)	8
نعت رسول مقبول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) ''بڑے بڑے بھی جہاں صورت گدا بیٹھے''	خالد زاہد مظفرنگری (مظفرنگر)	8
(افسانے/افسانچے)		
بدنصیب (افسانہ)	پروفیسر ارتضیٰ کریم (نئی دہلی)	9
جو تم ساتھ ہوتے (افسانہ)	ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا (نئی دہلی)	14
اُف! یہ مصیبت کا پہاڑ (افسانچہ)	ڈاکٹر اظہر حیات (ناگپور)	19
کچھ سست قدم رستے (افسانچہ)	مسرور تمنا (پونے)	20
(غزلیں)		
دھوپ نیزے اگر دِراتے ہیں	مدھوش بلگرامی (ہردوئی)	21
میں رہ گزارِ عشق پہ اُس مرحلے میں تھا	ڈاکٹر نبیل احمد نبیل	21
کچھ بھی کیجیے جناب ناممکن	ڈاکٹر قمر سرور (مہاراشٹر)	21
رمزِ تخلیق کی غایت سے عطا ہوتا ہے	سلیم کاوش	22
تجربوں سے گزر رہا ہوں میں	سلیم محی الدین	22
سب کے اذہان میں جو پستی ہے	فوزیہ اختر ردا (کولکاتا)	22
(مضامین)		
تبصرہ: جشن آزادی اور تاریخ کے حاشیے پر کھڑی عورت (تبصرہ)	ڈاکٹر رفیعہ نوشین (حیدرآباد)	23
انٹرویو: اُردو کے خاموش چراغ کامل جنیٹوی سے موبائل پر فکرانگیز نشست	یاسمین اختر طوبیٰ (گوجرانوالہ)	27
سفرنامہ: ہجرت کے بعد اُردو سے میرا رشتہ: امریکا میں اُردو ادب کی نئی جہات	سلیم خان (ٹیکساس۔امریکا)	32
(شخصیات)		
مولانا محمد عبدالملک جامعی مدنی: صاحب طرز ادیب اور مبلغ	معصوم مرادآبادی (نئی دہلی)	34
جو گزاری نہ جاسکی ہم سے، ہم نے وہ زندگی گزاری ہے (جون ایلیا)	پرویز ملک زادہ (لکھنؤ)	40
یادِ رفتگاں: سلیم ناصر: آواز، لہجے اور کردار کا وہ فنکار جو امر ہوگیا	شاہد نعیم (جدہ)	42
کتابوں کے جانثار، علم پیشہ اور کتاب ہتھیار ہے	محمد معین رضا رضوی (ناسک)	43
قلم قافلہ: شمس الدین حامد ناگپوری		46
سانحۂ ارتحال: سیّد محمد یاسین ندیم/بانو سرتاج	(ادارہ)	47
(آپ کے خطوط)		
آزادی نمبر۔۔۔ایک دستاویز		
خط ۱	ڈاکٹر رفیعہ نوشین (حیدرآباد)	48
خط ۲	عمران عاکف خان (راجستھان)	48
خط ۳	شجاع الدین شاہد (ممبئی)	48
خط ۴	پروفیسر آمنہ تحسین مانو (حیدرآباد)	48
خط ۵	ڈاکٹر اظہر حیات (ناگپور)	48
خط ۶	نفیسہ سلطانہ انا (بھوپال)	48
خط ۷	ارشد قدوائی (جدہ)	48

تقویٰ اور اللہ کا خوف

قرآنی آیت

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ حَقَّ تُقَاتِهِ وَلَا تَمُوتُنَّ إِلَّا وَأَنتُم مُّسْلِمُونَ

(آل عمران:102)

(ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو جیسا کہ اس سے ڈرنے کا حق ہے،
اور ہرگز نہ مرنا مگر اس حال میں کہ تم مسلمان ہو)

حدیث نبوی (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم)

اَتَّقِ اللهَ حَيْثُمَا كُنْتَ، وَأَتْبِعِ السَّيِّئَةَ الْحَسَنَةَ تَمْحُهَا، وَخَالِقِ النَّاسَ بِخُلُقٍ حَسَنٍ

(ترمذی)

(ترجمہ: اللہ سے ڈرو جہاں کہیں بھی تم ہو، برے کام کے بعد اچھا کام کرو
جو اسے مٹا دے، اور لوگوں کے ساتھ اچھے اخلاق سے پیش آؤ)

شعر

وہ ایک سجدہ جسے تو گراں سمجھتا ہے
ہزار سجدوں سے دیتا ہے آدمی کو نجات

(اقبال)

قومی معدہ اور اُردو کا مظلوم مجلہ

اداریہ

مدیرِ محترم کے نام ایک دردمندانہ خط

نعیم جاوید

محترم مہتاب قدر صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہ

اُمید ہے آپ، آپ کا قلم اور مظلوم مجلہ تینوں بقیدِ حیات رہیں گے۔ خیریت اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ آج کل اُردو رسائل طبعی موت سے کم اور قارئین کی بے حسی سے زیادہ زندہ درگور کیے جاتے ہیں۔

قاری کا مزاج معدہ نواز، شکم پرست، بریانی شناس مگر کتاب ناشناس، پکوڑا فہم مگر ادب نافہم، موبائل مست، مکتبہ فراموش، مشورہ آفرین، تعاون گریز، پی ڈی ایف پرست، سکرول شاہ اور علم کا شیدائی مگر قیمت کا مخالف ہو چکا ہے۔

مدیر اپنی جان اور سرمایہ کھپا کر اُردو کی دل کش حسینہ کو ICU میں بچا رہا ہے۔ مضامین موجود اور ادیب موجود، صرف وہ نایاب مخلوق لاپتا ہے جسے اصطلاحاً ''خریدار'' کہتے ہیں۔

ہماری قوم، علم کو واقعی ''انمول'' سمجھتی ہے۔ اسی لیے اس کی کوئی قیمت ادا نہیں کرنا چاہتی۔

ایک صاحب پانچ سو روپے کی کافی پی کر فرماتے ہیں: ''رسالہ سو روپے کا؟ بہت مہنگا ہے!''

گویا کافی ذہن میں اُترتی ہے اور رسالہ معدے میں جا کر تیزابیت پیدا کرتا ہے۔

اُردو والوں نے معدے کو مستقل رُکنیت دے رکھی ہے۔ طوفانی ناشتہ، زلزلہ خیز ظہرانہ، ہیبت ناک عصرانہ اور پُرشکوہ عشائیہ۔ ان سب کا بجٹ منظور ہے مگر ذہن، رُوح اور زبان برسوں سے مالی بحران کا شکار ہیں۔ معدے کی ہر درخواست ہنگامی بنیادوں پر منظور ہوتی ہے، جبکہ اُردو کتاب کی فائل یہ کہہ کر واپس کر دی جاتی ہے: ''آئندہ بجٹ میں دیکھیں گے!''

بریانی کی دیگ پر قوم متحد اور کتاب کی میز پر منتشر ہو جاتی ہے۔ سموسے کی قیمت بڑھے تو قومی اضطراب پیدا ہوتا ہے، مگر رسالہ بند ہو جائے تو لوگ آہ بھر کر کہتے ہیں ''بہت اچھا رسالہ تھا، ہم اکثر دوسروں سے لے کر پڑھتے تھے''!

مہتاب صاحب! مضمون نگار راتیں جلاتے، مصحح آنکھیں کھپاتا، مدیر سکون قربان کرتا اور ناشر سرمایہ داؤ پر لگاتا ہے؛ مگر قاریِ محترم فرماتے ہیں '' پی ڈی ایف مفت مل جائے تو ضرور پڑھوں گا۔''

پی ڈی ایف ملتے ہی اسے موبائل کے کسی فولڈر میں ابدی نیند سلا دیا جاتا ہے، جہاں نہ فائل کھلتی ہے، نہ اس کی فاتحہ خوانی ہوتی ہے۔ بعض ڈاؤن لوڈ مآب حضرات سینکڑوں کتابیں محفوظ کر کے خود کو ''صاحبِ کتب خانہ'' سمجھتے ہیں۔

میرا دردمندانہ مشورہ ہے کہ پورا مجلہ مفت بانٹ کر اس کی قدر کم نہ کیجیے۔ مفت چیز ہمارے ہاں پڑھی کم اور فارورڈ زیادہ ہوتی ہے۔ چند منتخب صفحات بطور تعارف دیجیے، مگر مکمل شمارہ نہیں۔

(۲)

سالانہ رُکنیت کو تحفہ بنائیے: شاید لوگ شادی پر پھولوں کے ساتھ ”گلبن“ کا رسالہ بھی دینے لگیں اور ازدواجی زندگی کے ساتھ زبان بھی سنور جائے۔ ”ایک طالب علم کی رکنیت“ اور ”ایک قاری کی سرپرستی“ جیسی اسکیمیں شروع کیجیے۔ جو خود پڑھنے سے معذور ہوں، انہیں کسی نوجوان کے مطالعے کا خرچ اٹھانے کی سعادت دیجیے۔ سالانہ معاونین کے نام سال میں ایک بار لکھیں۔ AI کے ذریعہ اس کے اشتہار بنائے جائیں۔

مطالعہ حلقے، مختصر صوتی تعارف، مصنف سے گفتگو، منتخب اقتباسات اور اہلِ قلم کے ساتھ ماہانہ آن لائن نشست قاری کو دروازے تک لاسکتی ہے۔ مگر اندر آنے کے لیے اسے رکنیت کی باعزت زحمت ضرور دیجیے۔

ہر شمارے پر یہ جملے بھی لکھے جاسکتے ہیں:

”اس مجلّے کی قیمت ایک متوسط کھانے سے کم اور اثر بدہضمی سے کہیں زیادہ دیرپا ہے۔“

”ایک برگر کم کھائیے، اُردو کو ایک مہینہ اور زندہ رکھیے!“

قاری کو سمجھانا ہوگا کہ رسالہ خریدنا کاغذ نہیں۔ زبان، فکر، تحقیق اور آئندہ نسل کے شعور میں حصہ خریدنا ہے۔ جو قوم معدے کی غذا بازار سے خریدے اور ذہن کی غذا مفت مانگے، اس کے ریستوران آباد مگر کتب خانے ویران رہتے ہیں۔

مدیر محترم! حوصلہ قائم رکھیے۔ اُردو ابھی مری نہیں؛ صرف بعض قارئین کی جیب اور ضمیر عارضی نیند میں ہیں۔ انہیں جگانے کے لیے کبھی دلیل، کبھی محبت اور کبھی ادبی چٹکی ضروری ہے۔

اللہ آپ کے مجلّے کو عمرِ دراز، اہلِ قلم کو مناسب معاوضہ اور قارئین کو جیب تک ہاتھ لے جانے کی توفیق عطا فرمائے۔

والسلام

ایک دردمند قاری، جو رسالہ مانگتا نہیں، خرید کر پڑھتا ہے۔

نعیم جاوید

اِدارہ نعیم جاوید صاحب کے خط کو من وعن بطور اداریہ استعمال کر رہا ہے کہ قارئین پہلے اِس فکر اَفروز تحریر سے مستفیض ہوں اور اپنی آراء سے مطلع کریں۔

تحفہء اہلِ حرم

محسن حبیب
(دوحہ قطر)

مرحبا صد مرحبا اے زائرِ ارضِ حرم
مرحبا اے صاحبِ ادراکِ بارانِ کرم

مرحبا اے شاھدِ خاکِ رسولِ ھاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم
مرحبا اے باریاب محورِ عرب و عجم

مرحبا اے خانہء فخرِ جہاں تو دیدئی
مرحبا اے چشمِ دیدارِ دیارِ محترم

مرحبا اے سیریابِ مدعائے عمرِ تام
مرحبا اے شاد گامِ روضہء فخرِ امم

مرحبا اے پاک طینت، مرحبا اے با مرام
مرحبا اے آشنائے آیہء لوح و قلم

مرحبا اے آشکارِ روضہء خیر البشر
مرحبا اے رہروِ راہِ رسولِ ذو الحشم

عشق کی منزل کہاں اور لیلیء محمل کہاں
ہر کسی کو یہ مقامِ مُعتبر حاصل کہاں

اب ذرا اے مُرشدِ حق درسِ حق وا کیجئے
اور کچھ اسرارِ خفتہ آشکارا کیجئے

کچھ وہاں کے خیرہ کن احوال بھی بتلایئے
کاروبارِ روز و شب کا حال بھی بتلایئے

اس حیاتِ سرمدی کا کیجئے کچھ تو بیاں
وہ حیاتِ جاودانی، اور فگارِ روح و جاں

کیفیت ہوتی ہے کیسی شہرِ دل کی اس جگہ
یادگارِ رحمتِ عالم عیاں ہے جس جگہ

کس طرح قابو میں رہتا ہے دلِ مُضطر وہاں
کیا چھلک جاتا نہیں پیمانہء آہ و فغاں

کیا شرارِ عشق کو رہتا ہے اس جا بھی قرار
کیا زبانِ عشق رہتی ہے وہاں پابندِ عار

آہ کیا آب و ہوا اس جا کی ہوتی اور ہے
آہ کیا قدرت وہاں پر تخم بوتی اور ہے

کیا وہاں کے کوکب و شمش و قمر بھی اور ہیں
روز و شب بھی اور ہیں قلب و نظر بھی اور ہیں

کیا وہاں بھی زندگی ہے خوگرِ آفات و شر
کیا وہاں بھی نشہء امراء کو روتی ہے نظر

کیا وہاں بھی آدمی ہے سجدہ ریزِ آدمی
کیا وہاں بھی ہیچ ہے قولِ رسولِ ہاشمی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کیا عقیدت میں وہاں بھی ایں وآں ہے زندگی
یا حقیقت کی حقیقی ترجماں ہے زندگی

کیا ہوائے نفس سے زاہد کو اس جا ہے فراق
یا وہاں بھی مبتلائے نفس ہے مثلِ عراق

کیا وہاں بھی فرقہ بندی طَورِ ہندوستان ہے
یا وہاں کی فرقہ بندی تابعِ فرمان ہے

رشتہء وحدت کا اس جا کیا کوئی منظر بھی ہے
زندگی اور بندگی کا کیا کوئی دفتر بھی ہے

کیا وہاں بھی زندگی کا مدعا مفقود ہے
کیا وہاں بھی طرزِ ملا' باید است و بودٗ ہے

یا وہاں بھی زندگی مانند آب ارزاں ہے کیا
اپنے ہی چارہ گروں کی چاہ کو ترساں ہے کیا

کیا خلافت مثلِ صدیقؓ و عمرؓ مشہور ہے
یا قیادت میں وہاں چنگیزیت مستور ہے

کیا وہاں اب تک ہے باقی نقشِ صدیقؓ و عمرؓ
کیا علیؓ ء مرتضی عثماںؓ کا اب تک ہے اثر

کیا بلالؓ و بو ذرؓ جانباز کا ایماں بھی ہے
آج تک کیا نقش ہائے خالدؓ و سلماںؓ بھی ہے

کیا خبیبؓ و حمزہؓ و عمارؓ کی آتی ہے یاد
تیرگیٔ جہل میں پاتا ہے اب کوئی مراد

جادۂ منزل پہ لٹتا اب بھی ابنِ عوف ہے
کیا شرارِ عشق کو طوفاں کا اب بھی خوف ہے

اب بھی کیا مسجد نبی کی نور سے معمور ہے
کیا سوادِ طیبہ اب بھی عشقِ حق میں چور ہے

کیا حقیقت ہے صفا مروہ کی کیسا راز ہے
آہ کیسا سوز ہے وہ آہ کیسا ساز ہے

آہ کیا وہ عشق ہی تھا یا تھا طرزِ ابتلا
کیوں اسے حق نے بشر کی زندگی میں بھر دیا

کیا منیٰ کا وہ نظارہ اب بھی عالمتاب ہے
محشرِ عرفات اب بھی رشکِ خونیں آب ہے

آہ کیا ہیں وہ فُجاجِ مکہ و طائف جہاں
تھا حریفِ حق جہاں کا بچہ و پیر و جواں

کیوں بہ صد آلام اتنی دور سے جاتے ہیں لوگ
کیا یہاں پاتے نہیں، اس جا سے پاتے ہیں لوگ

کیا وہاں کا درس اک حج کے سوا کچھ بھی نہیں
حج کے آگے منزلِ فوز و رضا کچھ بھی نہیں

تحفہء اہلِ حرم تسبیح اور زمزم ہی ہے
یا سراپا زندگی کو اسوہء پیہم بھی ہے

دُعا

شمیسہ فاروقی شمع

(جدہ)

اے رب! تُو مجھے اپنی محبت سے نوازے
یہ شوق مرے دل کی نگاہوں میں بسا دے

جو تجھ کو ہو محبوب وہی کام سکھا دے
بیکار سے اور لَغو سے تُو مجھ کو ہٹا دے

اِک جُہد مُسلسل ہو مری زندگی لیکن
اس جُہدِ مُسلسل کو عبادت ہی بنا دے

دنیا میں رہوں ایک مسافر کی طرح میں
سامانِ آخرت کو مری فکر بنا دے

اس دل سے ہر اک شَے کی محبت کو ہٹا کر
بس اپنی محبت کو مرے دل میں بسا دے

جو کچھ مجھے ملا ہے ترا فضل و کرم ہے
ہر آن ہی میں شکر کروں ایسا بنا دے

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

شاد اعظمی ندوی

(استاذ جامعہ اسلامیہ مظفر پور اعظم گڑھ)

لیا میں نے جب ان کا نام اللہ اللہ
مہکنے لگے دہن و کام اللہ اللہ

چمکتا رہا آفتابِ نبوت
وہ رحمت کا ماہِ تمام اللہ اللہ

دُرودوں کا نذرانہ اور نعت لکھنا
یہی شغل ہے صبح و شام اللہ اللہ

ہوا شور جب آپ القدس پہنچے
وہ نبیوں کے آئے امام اللہ اللہ

یہاں بالِ جبریل کی انتہا ہے
خدا جانے ان کا مقام اللہ اللہ

وہ دن آئے روضے پہ جب حاضری ہو
ملائک کہیں یہ غلام اللہ اللہ

مبارک مطہر مکرم معظم
ہوں تم پر کروڑوں سلام اللہ اللہ

یقیں ہے نبی اپنے ہاتھوں سے ہم کو
پلائیں گے کوثر کا جام اللہ اللہ

برسنے لگی شاد رحمت کی بارش
لیا میں نے جب ان کا نام اللہ اللہ

نعت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

خالد زاہد مظفر نگری

(مظفر نگر یوپی انڈیا)

بڑے بڑے بھی جہاں صورت گدا بیٹھے
بچھا کے ہم بھی وہیں اپنا بوریہ بیٹھے

قدم بڑھائے جو دار السلام کی جانب
کہاں ہیں کون ہیں اور کیا ہیں سب بھلا بیٹھے

سیاہ رخ سے مواجہ پہ کس طرح جاتے
سو ہم حضور کے قدموں کی سمت جا بیٹھے

جدھر بھی دیکھا نظر آیا گنبد خضریٰ
تصورات کا جب لے کے آئینہ بیٹھے

در رسول پہ پہنچا تو یوں قرار آیا
کہ جیسے تھک کے پرندہ شجر پہ جا بیٹھے

وہ صحن مسجد نبوی وہ چھتریاں زاہد
اداس جب بھی ہوئے ہم وہیں پہ جا بیٹھے

افسانہ

بدنصیب

پروفیسر اِرتضیٰ کریم
(نئی دہلی)

اُس کی چیخ ہسپتال کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی......

مجھے مارڈالو ڈاکٹر......

مجھے بچانے کی کوشش مت کرو......

میں مرجانا چاہتا ہوں......

میری سیما کہاں ہے۔سیما۔!!سیما۔!!

اور سیما کا نام اس کی زبان پر آتے ہی وہ خاموش ہو جاتا، جیسے کوئی بھولی بسری بات یاد آ گئی ہو اور اس کی آنکھیں اپنی کٹوری میں یوں گردش کرتی نظر آتیں، جیسے کوئی ...... لگّا اس کے سامنے ہو، پھر اس کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور وہ خیالوں کے دوش پر سوار ہو کر ماضی کے محل میں سیر کرنے لگتا، جو اب کھنڈرات میں تبدیل ہو چکے تھے۔

صبح تمہیں جانا تھا، مگر ہم اب تک اپنی گفتگو ختم نہیں کر پائے تھے۔صبح کرن پھوٹنے سے قبل ہم اپنے کمرے سے باہر آ گئے تھے۔ اور اپنی ادھوری گفتگو پوری کر رہے تھے، کہ کسی کی آہٹ پر ہم چونک گئے اور اپنے اپنے کمرے میں آ گئے تھے......تمہاری ٹرین دس بجے تھی ابھی صرف چار بج رہے تھے۔وقت کم تھا اور باتیں زیادہ......میں اداس ہو گیا کہ اب تم سے کب بات ہوگی۔ دل کی راہوں پہ یہ دیوار کہاں سے آ کھڑی ہوئی۔وفورِ جذبات سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے تھے اور میں پھر اپنے کمرے سے باہر آ گیا تھا۔

سیما......میں نے تمہیں آہستگی سے آواز دی تھی۔تم شرم وحیا کی دیوی اور حجابوں میں لپٹی خراماں خراماں میرے قریب آ گئی تھیں ......

میں نے تمہارا صندلی ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیا تھا......تمہاری پلکوں پر ستارے جھلملانے لگے تھے۔تمہارا چاند سا چہرہ روتے روتے زرد پڑ گیا تھا۔ روح کا کرب نگاہوں سے صاف عیاں تھا۔تم یاس وحرماں کی تصویر بنی میرے پاس کھڑی تھیں، میں کوشش کرنے کے باوجود صرف اتنا کہہ سکا تھا......”سیما......! اب تم جارہی ہو......؟!“

جہاں تمہیں جواں، دلکش اور دلفریب نظارے خیر مقدم کرتے ہوئے ملیں گے۔ گھنی خوبصورت، وجیہہ تمہارے حُسن پر مہرباں ہوں گے، تم پر مٹیں گے، تم پر کتنے فدا ہوں گے۔وعدہ کرو سیما کہ اس وقت بھی تم اپنی وفا کی قندیل میری تاریک شبِ فرقت کے لیے روشن کئے رکھو گی۔تم اپنی محبت کی شمع گل کر کے مجھے انجان اور اندھی راہوں پر بھٹکنے تو نہ دو گی۔ اس کی روشنی پرانی تو نہ ہوگی......؟!!اتنی سی بات کہتے کہتے کتنی بار میرا گلا بھر آیا تھا، اور وہ ستارے جو تمہاری پلکوں پر جھلملا رہے تھے اب تمہارے رخسار تک آ گئے تھے، تم نے میری کسی بات کا بھی جواب نہیں دیا تھا، مگر قطراتِ اشک زخمی آنکھوں سے نکل کر سرخ اور دہکتے عارض پر یوں لرز رہے تھے جیسے شام کے وقت سمندر کا پانی۔ گھر کے سب ہی لوگ بیدار ہو چکے تھے اور بادلِ نخواستہ ہم پھر جدا ہو گئے تھے۔

سیکنڈ، منٹوں میں اور منٹ، گھنٹوں میں منتقل ہونے لگے۔ یہاں تک کہ ٹرین کا وقت ہو چکا تھا۔ پلیٹ فارم پر کافی بھیڑ تھی، تم لوگوں کی نشستیں ریزرو تھیں، ہم اپنی اپنی سیٹوں پر بیٹھ گئے تھے۔ تم کھڑکی کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ میں باہر سے ہی کھڑا تم سے باتوں میں مصروف تھا۔ اگلے ہی لمحے گاڑی نے جدائی کی جھنڈی لہرادی اور گاڑی پٹریوں پر رینگنے لگی تھی۔ پھر تو وقت سے بھی تیز گاڑی بھاگتی چلی گئی اور آنکھوں سے اوجھل ہوگئی۔ میں نہ جانے کتنی دیر تک فضاؤں میں ہاتھ لہراتا رہا۔

تمہارے چلے جانے کے بعد پلیٹ فارم کی بھیڑ اور لوگوں کے قہقہے میرے غم کا بوجھ ہلکا کرنے میں ناکام رہے۔ قدرت کی ساری رنگینیاں ایک ہی پل میں اُداسیوں کی تصویر بن گئیں۔ دل کی طرح ہر شے پر ویرانیت اور اجاڑ پن کا احساس ہو رہا تھا۔ شب و روز تمہارے تصورات کی دنیا میں گم رہتا، تمہاری معصومانہ پیار بھری باتیں، دلفریب شرارتیں ایک ایک کر کے یاد آتی تھیں۔ بس جینے کے لیے ایک خط کا سہارا تھا، پھر جوں جوں دن گزرتے گئے، ہم اپنی مصروفیت میں کھو گئے، خط کم ہونے لگے ...... آج ایک مدت سے تمہاری کوئی خبر نگاہوں سے نہیں گزری، دل میں عجیب عجیب وسوسے جنم لینے لگے تھے کہ آج اچانک تمہارا خط آیا۔ تم نے خط میں لکھا تھا: ”راجن! ...... میری ہر سانس تمہاری امانت ہے، میرے دل کی دھڑکن پر تمہارا نام کئی بار صاف طور پر سنا جا سکتا ہے، میں کسی اور کی کبھی نہیں ہو سکتی، تم فوراً آ جاؤ ...... میری آنکھیں تمہارے انتظار میں فرشِ راہ بنی ہوئی ہیں۔“

میں نے تم تک پہنچنے کی پوری تیاری کر لی تھی وقت سے بہت قبل اسٹیشن آ چکا تھا۔ انتظار کے لمحے کتنے اذیت ناک ہوتے ہیں، اس کا احساس مجھے اب ہو رہا تھا، آخر ٹرین کا وقت ہو ہی گیا۔ دو دن کے سفر کے بعد میں تمہارے ”عشرت کدہ“ پہنچ گیا تھا مگر وہاں کا دلدوز منظر مجھ سے میرے حواس چھیننے کے لیے کافی تھا۔ منڈپ کے درمیان جلتی ہوئی آگ جیسے میری چتا جل رہی ہو، اس کی تپش نے میرے وجود کو خاکستر کر دیا، میرے احساسات و جذبات اس کے شعلوں کی نذر ہوتے نظر آئے، میں اندر ہی اندر بکھر گیا، میں لوٹ جانا چاہ رہا تھا کہ تمہارے بھائی نے مجھے دیکھ لیا۔ میں نے سارے احساسات پر قابو پاتے ہوئے اس کے ”نمسکار“ کا جواب دیا تھا۔

اگلے پل میں تمہاری ماں سے گفتگو کر رہا تھا کہ تم ہارے ہوئے سے جواری کی طرح، لٹتے ہوئے مسافر کی طرح آتی ہوئی دکھائی دیں۔ تمہارا رخِ روشن بے رحم حالات کی غمازی کر رہا تھا۔ تمہاری جھیل سی گہری خوبصورت آنکھیں جن میں ڈوب جانے کو جی چاہتا تھا، اپنی رعنائیاں کھو چکی تھیں۔ تمہارے ...... ہونٹ اپنی چمک کھو چکے تھے۔ تمہارا یہ حال

تمہاری مظلومی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

تمہیں آتا دیکھ کر ماں نے کہا تھا:"بیٹی سیما ......دیکھو! راجن آئے ہیں، تم ان سے باتیں کرو اور میں ابھی مانگنی کی مٹھائیاں بھیجتی ہوں۔"تم میرے بالکل قریب بیٹھ گئی تھیں...... میں نے ساری قوت کو یکجا کرتے ہوئے کہا تھا: "یہ کیا...... یہ کیا ہو گیا سیما؟ میری آنکھیں یہ کیا دیکھ رہی ہیں......؟"میری آواز بھرائی تھی۔

"کچھ نہ کہو راجن ...... کچھ نہ کہو......"تم رو رو کر کہہ رہی تھیں:"میں مجبور ہوں۔راجن مجھے مجبور کر دیا گیا ہے۔میری زبان بند کر دی گئی ہے۔میں بھی ان مشرقی لڑکیوں میں سے ایک ہوں جن کی عزت و حیا سارے زمانے میں مشہور ہے۔شرم وحیا نے مجھے والدین سے کچھ نہ کہنے دیا اور پھر تمہاری بے کاری نے مجھے اپنے اندر توانائی کا احساس نہ ہونے دیا۔صنفِ نازک جو ہوں۔حالات کے آگے گھٹنے ٹیک دینا ہی ہماری رویت ہے۔"

پھر اچانک تمہاری آنکھوں میں عجیب سی چمک پیدا ہو گئی تھی اور تم نے کہا تھا:"راجن...... آؤ......آؤ آؤ......میرے ساتھ......آؤ۔اس وقت جب ہم لوگ کبھی جدا نہ ہوں گے۔"یہ کہتی ہوئی تم مکان کی بالائی منزل سے ہوتی ہوئی، سب سے اوپر کھلی ہوئی چھت پر سے آئی تھیں۔

"تم ہمیں یہاں کیوں لائی ہو سیما؟ اب ہمارا تنہائی میں ملنا اچھا نہ ہوگا۔اب تم کسی اور کے دامن کی کلی ہو، تمہاری خوشبو میری زندگی کے چمن کو معطر نہیں کر سکتی ہے۔اس قسم کے فعل سے ہماری اور بدنامی ہو گی۔ ہمارا پیار رسوا ہوگا۔اب جو ہونا تھا ہو چکا......وقت گزر چکا، مزید بدنامی سے کیا فائدہ؟ مجھے بھول جاؤ، ان ٹوٹتے ستاروں کی طرح جو آسمان سے ٹوٹ کر گرے ہیں اور...... آسمان سے ٹوٹ کر گم ہو جاتے ہیں اور دیکھو آسمان کسی سے شکایت نہیں کرتا۔تم تو ایک سیپ کی مانند ہو۔تمہارے اندر اس کا وہی قطرہ جائے گا جس کی قسمت میں موتی بننا ہو۔ میں بارش کا وہ قطرہ نہیں ہوں بلکہ نداموتوں سے بجتی ہوئی ایک دھارا ہوں۔محبت وہ گلشن ہے سیما......! جس میں عموماً بہاریں کم آتی ہیں اور آتی بھی ہیں تو عارضی طور پر......"

"محبت کبھی مٹ نہیں سکتی راجن ...... محبت کو کبھی موت نہیں آسکتی۔یہ تو خدا کی طرح لافانی ہے۔ اس سے تو بنی آدم کا ظہور ہوا۔ اٹوٹ رشتہ ہے۔ یہ ایسا رشتہ ہے جیسے جسم اور روح ہے۔جسم فنا ہو سکتا ہے مگر روح تو ہر صورت میں اَمر ہے۔بغیر روح کے جسم بے کار ہے۔ بغیر تمہارے میرا مقصدِ وجود نامکمل ہے۔ہم کو ایک ہونا ہے۔"کہتے ہوتے تم کھلی چھت کے اس آخری کنارے پر آئی تھیں۔تمہاری گرفت میرے ہاتھوں پر سخت ہوتی چلی گئی اور اچانک تم نے اپنے وجود کو نیچے ڈھلکا دیا تھا۔پھر کیا ہوا تھا مجھے کچھ پتہ نہیں...... مجھے کچھ یاد نہیں......

اس نے پھر سے اپنی آنکھیں کھول دیں تھیں۔میں اس کے قریب کھڑا ہوا ہوں۔ وہ مجھے پاس بلاتا ہے مجھ سے خوشامد کرتا ہے کہ میری سیما کہاں ہے۔ اس کی آنکھیں گہری سرخ ہو رہی ہیں۔اس کے زخموں سے خون بہہ رہا ہے۔

وہ کہہ رہا ہے"کیا تم مرنے والے کی آخری خواہش کو پورا کر سکو گے......؟!"

میں نے اپنا سارا قصہ بتا دیا اور پھر یہ بھی کہا کہ سیما زمین پر نہیں آسمان تک پہنچ گئی۔وہ مر چکی ہے۔

کیا میں وعدہ وفا کر سکوں گا......؟

اس کی یہ سنتے ہی سارا ہسپتال لرز اٹھا۔

نہ سیما کے ساتھ جی سکا نہ مر سکا اف! میں کتنا بدنصیب ہوں، کتنا بے وفا ہوں

اور بس یہ چیخ فضاؤں میں گونجتی رہی ......گونجتی رہی......ہم سفر کرائے کا

زندگی اور سفر......کتنا گہرا رشتہ ہے۔

کون ہے یہاں جو مسافر نہیں......کون ہے جو بس چلتا نہیں رہتا......رُک جانا تو موت کے مترادف ہے۔اس لیے رکنے اور ٹھہرنے کو کوئی گلے لگانا نہیں چاہتا۔

گاڑی آگے بڑھتی رہتی ہے، سفر شروع ہوتا ہے، سفر ختم نہیں ہوتا......منزل......منزل۔کہاں۔

مُنزل کا وجود تو خیالی ہے۔لوگ خیال میں منزل متعین کرتے ہیں۔پھر اس منزل پر پہنچ کر دوسری منزل کی تلاش جاری ہو جاتی ہے۔زندگی کا سفر یوں ہی طے ہوتا رہتا ہے۔

کائنات میں بکھرتی رہتی ہے، یا ہم کائنات کو ڈھونڈتے رہتے ہیں۔لیکن یہ بارہا ثابت ہوا ہے کہ زندگی کے سفر میں تنہائی بڑی شاق گزرتی ہے۔ یہ تنہائی کبھی دوست کے ذریعے ختم کی جاتی ہے،کبھی سبک حیات کوساتھ لے کراور کبھی کسی ہم سفر سے رشتہ ناطہ پیدا کر کے۔

ریل کے ڈبے میں، میں اور میری بیوی ایک ایک برتھ پر لیٹے آگے کا سفر طے کر رہے ہیں۔میں"رومانی دنیا" میں کھویا ہوا ہوں اور میری بیوی جب پڑھتی پڑھتی بور ہوتی ہے تو مجھ کومیرے سامنے برتھ پر بیٹھے ہوئے ایک حسین جوڑے کی جانب متوجہ کرتی ہے اور کہتی ہے " زندگی اس جوڑے کی ہے کہ سفر میں بھی ایک دوسرے ہم آغوش ہیں۔ ایک دوسرے کو پیار کرتے ہیں۔"مگرتم، تم تومیگزین سے پیار کرتے ہو۔میگزین میں کھوئے رہتے ہو۔ میں یک لخت اس جوڑے کی طرف دیکھتا ہوں پھر اپنی میگزین میں کھو جاتا ہوں۔ مجھے بیوی کا عین کلائمکس کے وقت مخل ہونا شاق گزرتا ہے مگر ہو بھی کیا سکتا تھا؟ میں دو ورق پیچھے سے پڑھنا شروع کردیتا ہوں اور میری بیوی بھی کسی مسافر سے اخبار مانگ کر پڑھنے لگتی ہے مگر وہ اخبار تو کم پڑھ رہی تھی۔ اگلی برتھ پر بیٹھے ہوئے جوڑے پر اس کی توجہ زیادہ تھی۔

میری آنکھ لگی جارہی تھی یا لگنے والی تھی کہ اچانک میری بیوی نے پھر جھنجھوڑا اور میں بھی اس کی طرف دیکھنے لگا۔کون سو رہا تھا......کون جاگ رہا تھا......اورکون کس کام میں مشغول تھا ......اسے دیکھنے کی فرصت کسے تھی؟ گاڑی چل رہی تھی اور ہمارا سفر طے ہو رہا تھا۔میری بیوی نے آواز دی ہے......تم دیکھتے نہیں؟ وہ لوگ، وہ لوگ ابھی تو زن وشو ہیں۔ دیکھو تو کیسا ایک دوسرے میں کھوئے ہوئے ہیں۔ باتیں کرتے جاتے ہیں اور مسکراتے جاتے ہیں۔ درمیان میں وہ لوگ ایک دوسرے کا بوسہ بھی لے لیتے ہیں۔کتنا خوش مزاج اور محبت کرنے والا شوہر اسے نصیب ہوا ہے۔کتنی خوش نصیب ہے یہ عورت!اورایک تم ہو کہ گاڑی میں نہ سوار ہوئے گویا کسی لائبریری میں آکر بیٹھے ہو کہ کبھی اخبار اورکبھی پرچہ......

کہتے ہیں سفر کو خوش گوار بنانا ہو، سفر کی تلخیوں کوکم کرنا ہوتو انسان کو چاہیے کہ خوش گپیاں کرتا رہے۔ باتوں میں دل بھی بہل جاتا ہے اور وقت بھی گزر جاتا ہے......تم نے سنا نہیں، خاموشی سے مصیبت اور بھی سنگین ہوتی ہے۔

اور یہ سفر...... یہ سفر بھی تو ایک مصیبت ہی ہے۔ اس پر تمہاری یہ خاموشی ...... دیکھو ان لوگوں کو کچھ ہوش نہیں کہ کون سا اسٹیشن آیا اور کون گزر گیا......کون سوار ہوا......کون ساتھ چھوڑ گیا...... وہ لوگ شاید زندگی کا ایک لمحہ بھی گنوانا نہیں چاہتے۔ وہ ایک ایک لمحہ پیار ومحبت کے ماحول میں گزارنا چاہتے ہیں......

"وہ لوگ......"

مجھے ایسا محسوس ہوا۔میرے سامنے بیٹھی ہوئی عورت بھی اپنے شوہر سے ایسی ہی باتیں کر رہی ہے ...... آہستہ آہستہ سارے کمپارٹمنٹ میں ایک قسم کی بے اطمینانی اور بے چینی کی فضا چھاگئی۔ ہر ایک غیر مطمئن تھا......مگر میں......؟ میں تو بالکل مطمئن ہوں ...... اطمینان کا انداز بھی بڑا اضافی ہے۔کون......کب......اورکس حد تک مطمئن ہوتا ہے اس کا فیصلہ دشوار ہے۔

ہم حقیقت سے آشنا اس لیے ہیں کہ ہم اس کمپارٹمنٹ کے اکلوتے پرانے مسافر ہیں ...... ہمارا سفر گاڑی کے ساتھ ختم ہوگا ......ہمیں وہاں تک جانا ہے جہاں تک یہ گاڑی جاتی ہے......

لو پھر گاڑی کی رفتار سست ہونے لگی...... شاید پھر کوئی اسٹیشن آنے والا ہے......کسی کے انتظار کے لمحات ختم ہوئے ......کوئی منزل تک پہنچنے والا ہے......منزل......کیسی منزل......کس کی منزل......؟! گاڑی کو ابھی بہت دور تک جانا ہے......میری منزل بھی دور ہے، میرا سفر بھی لمبا ہے......لیکن اس طویل سفر میں ...... ہاں اس طویل راستے میں گاڑی کا کون ساتھ دیتا ہے؟ بہت کم لوگ ہیں...... بہت کم......! میری طرح گاڑی کا ساتھ دینے والے......

گاڑی وہی رہتی ہے ...... مسافر بدلتے جاتے ہیں ......نئے پرانے ...... پرانے نئے ...... انہیں تو اپنی منزل کی تلاش ہے۔ ان کی

منزل، ہاں، ان کی منزل تو الگ ہے لیکن گاڑی اس سفر میں ان کی ہم سفر ہے......گاڑی ساتھ نہیں چھوڑتی، مسافر ساتھ چھوڑ دیتے ہیں...... گاڑی اور مسافر کا رشتہ ویسا ہی سفر کا ہے جیسا آدمی اور مسافر کی منزل کا......منزل؟

ہم سفر......منزل......ہم سفر تو ہے لیکن منزل......منزل......ہاں منزل تو جدا جدا ہے ......مجازی ہم سفر......کرائے کا ساتھ......پل دو پل کا ساتھ......کب تک......؟ کہاں تک؟

اندھیرا ہو چکا ہے......مگر لوگوں کی نگاہیں اندھیرے میں بھی دیکھ رہی ہیں......سرگوشیاں ......چہ میگوئیاں......حیرت وحسرت......

چھی چھی، کتنی بے شرم ہے یہ عورت...... تم تو یوں ہی بولتی ہو......کتنا پیار ہے دونوں میں ......ایک ہم ہیں......یہ بڈھے کھسوٹ لوگ ......لکیر کے فقیر......کیا جانیں دنیا کتنی آگے بڑھ گئی ہے......

کتنی خوش نصیب ہے یہ عورت جس کو اتنا چاہنے والا ملا......واقعی کتنی خوش گوار ہے زندگی......

تم نہیں سمجھو گی......مگر ان آنکھوں دیکھا کیسے جھٹلاؤں گی......؟!

سراب بھی دکھائی دیتا ہے......مگر سراب اور حقیقت میں فرق ہے......تم یوں ہی باتوں کو پیچیدہ بنا دیتے ہو......

حقیقت پیچیدہ ہوتی ہے......تم نہیں سمجھو گی......اور سمجھاؤں گا تو زندگی کو سمجھ جاؤ گی لیکن کب، کس نے زندگی کو سمجھا ہے؟ یہ تو کسی کی گرفت کے پرے ہے۔

دیکھو وہ ایک دوسرے سے لپٹے ہوئے کتنے سکون کی نیند سو رہے ہیں......سُکھ ہاں سُکھ......ہم بھی سو جائیں بہت رات ہو گئی ہے ......چلو......سیاہی کی چادر نے سارے منظر پر غلاف ڈال دیا ہے......چلو سو جائیں، نیند آ رہی ہے......

رات کی تاریکی......نیند کا خمار......ختم ہو چکا ہے، اجالا ہو چکا ہے......آنکھ کھلتے ہی میری بیوی کی نگاہیں پھر اسی جگہ مرکوز ہو جاتی ہیں مگر وہاں تو صرف وہ ہے......ہاں وہ اکیلی تھی۔ لیکن وہ؟ وہ......وہ......شاید باتھ روم گیا ہے...... میرے پہلو والے برتھ کے مسافر بھی کہیں اُتر گئے تھے اور سامنے کا برتھ بھی خالی تھا......شاید ان کی منزل آ گئی تھی......مگر ہمارے ڈبے میں سارے مسافر نئے تھے۔

ایک ہم......

لیکن......آخر......وہ کہاں گیا؟

باتھ روم......لیکن نہیں......بہت دیر ہو چکی ہے......وہ آ گیا......دیکھو کتنی گرم جوشی ہے دونوں کے ملنے میں......لیکن یہ......؟ یہ وہ تو نہیں ......!وہ کہاں گیا......؟ شاید......لیکن......یہ وہ......روک لیا گیا، یہ کہاں سے آیا......

گاڑی پھر چلنے لگی......کہ گاڑی چلتی رہتی ہے......ہم غیر مطمئن......مطمئن......؟ حقیقت سے نا آشنا......! حقیقت سے آشنا......!

گاڑی وہی رہتی ہے......مسافر بدل جاتے ہیں......نئے مسافر کے لیے نیا منظر...... بوسہ......پیار......محبت......سفر میں ......؟

ہمارے سامنے پھر وہی منظر......ماحول میں پھر وہی بے چینیاں......وہی چہ میگوئیاں ......کتنی پیاری جوڑی ہے......کتنی خوش نصیب عورت ہے......چھی چھی......مسافر نئے تھے ......فقرے پرانے......

کون سمجھے گا پرانے آدمی سے نئے رشتے کو......آدمی آدمی رہ جاتا ہے......رشتے نئے اور پرانے ہوتے رہتے ہیں۔ گاڑی چلتی رہتی ہے۔ کوئی مسافر آسودہ ہوتا ہے......کوئی غیر مطمئن......گاڑی جھٹکے سے رُک جاتی ہے......

میں اور میری بیوی بھی اتر جاتے ہیں ......لیکن وہ عورت اپنی بیڈنگ کے ساتھ پلیٹ فارم پر کھڑی چاروں طرف دیکھتی ہے...... زندگی کا سفر......

طویل پُر پیچ اور ہم سفر کوئی نہیں۔

امید و یاس کا جیتا جاگتا پس و پیش......

نئے مسافر کی تلاش!!!

اور میں اور میری بیوی اطمینان سے پلیٹ فارم سے باہر کی طرف چل دیتے ہیں......اپنی منزل کی جانب......

افسانہ

جو تم ساتھ ہوتے

کہانی صرف ایک چوری کی نہیں
ایک احساس کی ہے۔۔۔ جو کسی کے نہ ہونے

ڈاکٹر نعیمہ جعفری پاشا
(نئی دہلی)

جسٹس سنگھ اپنی شاندار کوٹھی کے برآمدے میں آرام کرسی پر آنکھیں بند کیے نیم دراز تھے۔ ان کی پیشانی پر فکر کی کئی لکیریں ان کے ذہنی اور نفسیاتی تناؤ کی غماز تھیں۔ایک ہاتھ سر کے پیچھے تھا دوسرا سینے پر رکھا تھا۔کبھی کبھی اضطراری طور پر ایک ٹانگ ہلانا شروع کردیتے تھے۔ ان کی ہر حرکت سے ظاہر ہورہا تھا کہ وہ سخت پریشان تھے۔ اپنے اردگرد کے ماحول سے قطعی طور پر منقطع تھے۔

سورج دھیرے دھیرے سر ابھارہا تھا۔ ماحول میں خوش آئند خنکی تھی۔ ناریل کے اونچے درخت پھلوں سے لدے ہوئے تھے۔ دوسرے درخت بھی پھلوں اور پھولوں کا بار سنبھالے دھیرے دھیرے جھوم رہے تھے۔سرسبز لان پر جگہ جگہ کیاریوں میں پھولوں کے پودے ماحول کی دلکشی میں اضافہ کررہے تھے۔کہیں دور سمندر کی آتی جاتی لہروں کی دھیمی دھیمی گنگناہٹ سے ماحول میں نغمگی گھلی ہوئی تھی۔لیکن جسٹس سنگھ قدرت کے ان انمول خزانوں سے مکمل طور پر بے خبر اپنی ہی سوچوں میں گم تھے۔

گزشتہ چھ مہینوں میں ان کے گھر میں چوری کا یہ تیسرا واقعہ تھا۔ چھ ماہ قبل ایک دن صبح عدالت جاتے وقت جب الماری سے انھوں نے اپنا والیٹ نکالا تو وہ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ والیٹ خالی تھا، جبکہ انھیں اچھی طرح یاد تھا کہ رات کو سونے سے پہلے انھوں نے پانچ ہزار روپے والیٹ میں رکھے تھے۔ ان کے چیمبر میں جو چپراسی تھا اس کی بیٹی کی شادی تھی۔ اسی کو دینے کے لیے انھوں نے یہ رقم رات کو والیٹ میں رکھ لی تھی کہ کہیں صبح بھول نہ جائیں۔ الماری میں کپڑے الٹ پلٹ ڈالے۔کوٹ کی جیبوں میں تکیے کے نیچے،سائڈ ٹیبل پر رکھی کتابوں کے اندر،لیکن پیسوں کے گویا پر لگ گئے تھے۔ گھر میں ان کا قدیم وفادار اور ایمان دار نوکر غفور رہتا تھا جو برسوں سے ان کے ساتھ تھا اور جسے وہ پنجاب سے اپنے ساتھ لائے تھے۔ باقی نوکر رات کو گھر کے باہر آؤٹ ہاؤس میں رہتے تھے۔غفور پر شک کرنا خود اپنے آپ پر شک کرنے جیسا تھا۔ پھر بھی انھوں نے غفور کو بلا کر صورت حال بتائی۔ غفور پریشان ہوگیا اور اپنی بے گناہی کا یقین دلانے لگا۔جسٹس سنگھ نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر تسلی دیتے ہوئے کہا:"غفور میں تم پر شک کر ہی نہیں سکتا۔ اپنے بھائی پر شک کرلوں گا لیکن تم پر نہیں کروں گا۔ میں صرف چاہتا ہوں کہ تم تلاش کرو اور اندازہ لگاؤ کہ پیسہ کہاں جاسکتا ہے۔رات سونے سے پہلے میں نے روپے والیٹ میں رکھے تھے۔" عدالت کا وقت ہورہا تھا۔ جسٹس سنگھ چلے گئے اور غفور پاگلوں کی طرح ہر کونے میں ہر کمرے

میں تلاش کرتا رہا۔لیکن ناکام رہا۔اسے سب سے بڑی فکر یہی تھی کہ کہیں مالک کے دل میں میری طرف سے شک کی گانٹھ نہ پڑ جائے۔غفور نے دوسرے نوکروں سے بھی چھان بین کی۔ حالانکہ وہ سب رات کے کھانے کے بعد اپنے اپنے کواٹروں میں چلے جاتے تھے۔ بات پرانی ہوگئی لیکن گتھی سلجھ نہیں پائی۔

جسٹس سنگھ کو گھڑیوں کا بہت شوق تھا۔ دنیا بھر کی نادرونایاب گھڑیاں ان کے خزانے میں جمع تھیں۔سب ہی جانتے تھے اسی لیے سالگرہ پر، شادی کی سالگرہ پر یا تیج تہوار پر لوگ انھیں گھڑیوں کا ہی تحفہ دیتے تھے۔ان کے گھڑیوں کے کلیکشن کی قیمت لاکھوں روپے تھی۔ اپنا یہ خزانہ وہ ایک قیمتی باکس میں رکھ کر اپنی الماری کے لاکر میں رکھتے تھے۔کبھی کبھی کوئی خاص دوست یا عزیز آتا تو اسے ضرور دکھاتے اور داد و تحسین وصول کرتے۔ایک اتوار کو صبح کچھ بے چینی سی تھی۔ دل نہیں لگ رہا تھا۔سوچا گھڑیاں نکال کر دیکھی جائیں۔ دروازہ بند کر کے لاکر سے باکس نکالا جو بہت ہلکا لگا۔ گھبرا کر ڈبہ کھولا تو وہ خالی تھا۔جسٹس سنگھ کے پاؤں کے نیچے سے زمین نکل گئی۔ لڑکھڑا گئے۔چکراتے ہوئے سر کو تھام کر انھوں نے پورا لاکر چھان مارا۔ الماری کے سبھی خانے کھول کے دیکھ ڈالے۔سارے کپڑے نکال کر زمین پر ڈھیر کردیئے۔لیکن بے سود۔ انھیں لگا کہیں انھیں ہارٹ اٹیک نہ پڑ جائے۔دروازہ کھول کرغفور کو آواز دی اور بیڈ پر ڈھے سے گئے۔کمرے کی حالت اور جسٹس سنگھ کی کیفیت دیکھ کر غفور پریشان ہوگیا۔ دل بے طرح دھڑکنے لگا۔"کیا ہوگیا سرکار"؟۔

"غفور تم نے میری گھڑیوں کا کلیکشن تو دیکھا ہوگا"۔

"جی سرکار۔ایک آدھ بار۔جب آپ کسی کو دکھا رہے تھے تو نظر پڑی تھی۔"غفور کے دل میں وسوسے سر اٹھانے لگے۔

"غفور میری گھڑیاں غائب ہیں۔ڈبہ خالی پڑا ہے،"انھوں نے بمشکل کہا۔

غفور کی تو جیسے جان ہی نکل گئی۔"کیسے سرکار وہ تو آپ دوہرے تالے میں رکھتے تھے۔"!

"ہاں!اور چابی بھی ایسی جگہ رکھتا تھا کہ

کسی کو نہ ملے۔ چابی اسی جگہ رکھی ہے۔ لاکر بھی بند تھا۔ ڈبہ بھی موجود ہے۔ لیکن گھڑیاں غائب ہیں۔"

غفور رو پڑا۔"قسم لے لیجئے سرکار میں نے تو وہ گھڑیاں پاس سے کبھی دیکھی بھی نہیں تھیں۔ مجھے تو یہ بھی نہیں معلوم کہ وہ گھڑیاں آپ رکھتے کہاں تھے۔"

میں تم پر شک نہیں کررہا غفور، لیکن حیران ہوں۔ یہ دوسری چوری ہے جو میرے کمرے میں، میری الماری میں سے ہوئی ہے۔ جبکہ دروازے پر گارڈز کا پہرا رہتا ہے۔"

غفور کا مارے ڈر کے برا حال تھا۔تھر تھر کانپ رہا تھا۔"سرکار آپ میرے سامان کی تلاشی لے لیجئے۔"

"دیکھو غفور یہ بہت بڑی چوری ہے۔ پولیس میں تو رپورٹ کرنی ہی پڑے گی۔ پولیس والے آئیں گے تو سب ہی نوکروں کی تلاشی لیں گے میں انھیں روک تو نہیں سکوں گا۔"

پولیس میں رپورٹ ہوئی۔ معاملہ ہائی کورٹ کے جج کے یہاں چوری کا تھا۔ پولیس کے بڑے افسر بذات خود تفتیش کے لیے آئے۔ گارڈز سے اور نوکروں سے پوچھ گچھ ہوئی۔ تلاشیاں ہوئیں اور سب سے زیادہ شک کی سوئی غفور پر ہی رکی، کیونکہ چوبیس گھنٹے وہ ہی گھر پر رہتا تھا۔ اسے دو دن لاک اپ میں بھی رکھا گیا۔ حالانکہ جسٹس سنگھ نے خاص ہدایت کردی تھی کہ"یہ بوڑھا آدمی ہے بہت پرانا اور وفادار ہے اس کو جسمانی اذیت نہیں دی جائے۔"

غفور واپس آگیا لیکن اب اس کا دل اچاٹ ہوچکا تھا۔ نوکری چھوڑ کے بھی نہیں جاسکتا تھا کہ تفتیش چل رہی تھی۔ ہر دوسرے روز پولیس والے پوچھ گچھ کرنے آجاتے۔ اخباروں نے بھی پہلے صفحے پر سرخی جمائی۔" ہائی کورٹ کے جسٹس سنگھ کے گھر چوری۔"

دہلی سے پریما کا فون آیا۔ جلے پر تیل چھڑکتی رہی۔"اور پڑے رہو اس چھوٹی سی ریاست میں، نکسلوں اور آتنک وادیوں میں۔ تمہارے لیے تو تمہارے اصول اور So-called انصاف پسندی ایمان داری، بیوی بچوں، گھر بار سب سے بڑھ کر ہے نا!"

جسٹس مہندر سنگھ پریم کور عرف پریما کو کیا سمجھاتے کہ اس چوری کا کوئی تعلق ان کے اصولوں اور انصاف پسندی سے بالکل بھی نہیں ہے۔"صرف اتنا ہی کہا۔

"تم ساتھ رہتی ہوتیں تو یہ نہ ہوتا۔"

پریما تڑخ کر بولی:"میں پاگل نہیں ہوں۔ اچھی خاصی دہلی کی پریکٹس چھوڑ کر اس پچھڑے صوبے میں رہوں۔ تم بھی ذرا عقل اور دنیاداری سے کام لیتے تو دہلی ہائی کورٹ میں ہوتے۔ میں اور میری بیٹی یہاں خوش ہیں۔ اب بھی سمجھ سے کام لو تو ٹرانسفر ہوسکتا ہے۔"مہندر سنگھ نے فون بند کردیا۔ اس عورت سے تو بات کرنا بھی دشوار تھا۔ کسی ہمدردی یا تسلی کی امید ہی فضول تھی۔

مہندر سنگھ اور پریم کور دونوں نے قانون کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد دہلی ہائی کورٹ کے ایک مشہور سینئر وکیل کی سرپرستی میں پیشہ ورانہ زندگی کی ابتدا کی۔ مہندر سنگھ کا خاندان وکیلوں کا خاندان کہلاتا تھا۔ دادا، باپ، چچا سب وکیل تھے۔ دادا کی تعلیم اپنی اولادوں کے لیے ہمیشہ یہی رہی تھی کہ"سچائی، ایمان داری اور انصاف پسندی، انسانیت کے تین ستون ہیں۔ کبھی پیسے کے لیے انھیں نہ بیچنا۔" پاپا جی ہمیشہ ان اصولوں پر کار بند رہے لیکن چاچا جی کے منطقی ذہن نے اپنا راستہ الگ بنایا۔ وہ فوجداری کے وکیل تھے۔ زیادہ تر انڈر ورلڈ کے گینگسٹرز کے کیس لڑتے تھے۔ انھیں بے گناہ ثابت کرکے اپنی تجوریاں بھرتے رہے۔ ان کے ٹھاٹھ باٹ دیکھنے کے قابل تھے۔ جبکہ پاپا جی نے دار جی (دادا) کی نصیحت پر عمل کیا اور متوسط طبقے کی زندگی گزاری۔ پاپا جی مہندر سنگھ کے بھی آئیڈیل تھے، جبکہ پریما کا کہنا تھا

کہ ”وکیل بھی ایک جنگ لڑتا ہے اور محبت اور جنگ میں سب جائز ہے۔ نام اور دولت کمانی ہے تو اصولوں کی قربانی دینی پڑے گی۔“

اصولوں کی بات الگ ویسے دونوں ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے تو شادی ہوگئی۔ گھریلو زندگی کچھ سال تک خوشگوار رہی۔ بیٹی کی پیدائش نے زندگی میں مزید پھول کھلا دئے۔ لیکن رفتہ رفتہ نظریاتی اختلافات بڑھتے گئے۔ پریما نے سرکاری وکیل بن کر حکومت وقت کا ساتھ دیا بعد میں ذاتی پریکٹس میں بھی کامیابی اور دولت نے قدم چومے۔ مہندر سنگھ اصولوں سے سمجھوتہ نہ کر سکے۔ دس سال کی پریکٹس کے بعد ہائی کورٹ کے جج کے عہدے کے لیے مستحق ٹھہرے لیکن اصول ہر گام پر قدموں میں بیڑیاں ڈالتے رہے۔ آخر پندرہ سال کی پریکٹس کے بعد ہائی کورٹ کے جج کا عہدہ ملا لیکن دور دراز غیر اہم صوبوں میں تقرر ہوتا رہا۔ پریما سے اصولوں پر ہمیشہ جھگڑا ہی رہا۔ وہ خود بہت کامیاب اور نامور وکیل تھی۔ اس نے جج کے عہدے کو منفعت بخش نہیں سمجھا۔ اور کبھی مہندر سنگھ کا ساتھ بھی نہیں دیا۔ ہمیشہ دہلی میں رہی۔ سپریم کورٹ تک پہنچ گئی۔ بیٹی کو بھی اپنے ساتھ رکھا اور اپنا ہم خیال بنا کر باپ سے دور کر دیا۔

جسٹس مہندر سنگھ کو ازدواجی زندگی میں ہمسفر کا سچا ساتھ کبھی نہیں ملا۔ زندگی کے سمندر کی تند اور سبک لہروں میں وہ تنہا ہی نبزد آزما رہے۔ چھٹیوں میں بھی وہ ہی دہلی چلے جاتے تھے لیکن اس شاندار بنگلے کی مصنوعی زندگی میں چند دن میں ہی دم گھٹنے لگتا۔ بیٹی رشمی کے اظہار محبت میں بھی انھیں سطحی پن اور مصنوعیت محسوس ہوتی۔ پریما بات بات پر طعنے دینے سے باز نہیں آتی۔ اور وہ پھر اپنی پوسٹنگ پر لوٹ آتے۔ حد یہ کہ گھر میں ہونے والی چوریوں کی خبر سن کر بھی اس نے نہ فکر کا اظہار کیا، نہ ہمدردی کے دو لفظ کہے اور نہ ہی ایک دن کے لیے بھی آنے کی تکلیف گوارا کی، کیونکہ اس کے بعض اہم مقدموں کی تاریخ سامنے تھی۔ مہندر سنگھ کو وہ کندھا ہی نہیں ملا جس پر سر رکھ کر وہ دو گھڑی سکون کی سانس لیتے اور یہ محسوس کرتے کہ کوئی ان کی فکر بانٹنے والا اس دنیا میں موجود ہے۔ ریٹائرمنٹ میں ایک سال رہ گیا تھا۔ پریما کا دباؤ تھا کہ اب بھی اپنے اصولوں کو طاق پر رکھ کر چیف جسٹس یا وزیر قانون کی چمچہ گری کر لیں تو ملازمت کے آخری سال دہلی ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بن سکتے ہیں۔ لیکن مہندر سنگھ اپنی زندگی بھر کی کمائی عزت نفس کسی صورت گنوانا نہیں چاہتے تھے۔

جسٹس سنگھ کے گھر میں ہونے والی تیسری چوری نے تو پورے صوبے میں زلزلہ پیدا کر دیا۔ یہ گرونانک جی کی سونے کی مورتی تھی جو دار جی (دادا) کو کسی امیر موکل نے مقدمہ جیتنے پر پیش کی تھی۔ دار جی نے پاپا جی کو دی تھی اور پاپا جی نے آخری دنوں میں مہندر سنگھ کو یہ وراثت سونپ دی تھی۔

اس مجسمے کی چوری نے جسٹس سنگھ کو اندر تک ہلا کر رکھ دیا تھا۔ پولیس کا محکمہ مزید حیران و پریشان تھا۔ ساتھ ہی چوکسی بھی بڑھا دی تھی۔ کوٹھی کے چاروں طرف اور صدر دروازے پر گارڈز بڑھانے کے باوجود چوری ہوگئی اور وہ نادر و نایاب مجسمہ غائب ہوگیا۔ اب تو جسٹس مہندر سنگھ کا اعتبار ہر شخص پر سے اٹھ چکا تھا۔ حد یہ کہ غفور کی طرف داری بھی اب سرسری ہی رہ گئی تھی۔ پولیس والے حیران تھے۔ غفور دن رات کوٹھی میں رہتا۔ کبھی گھر سے باہر نہیں نکلتا۔ اگر وہ چور تھا تو چوری کا مال آخر اس نے چھپایا کہاں؟ جبکہ گھر کا کونا کونا چھانا جا چکا تھا۔ جسٹس سنگھ کا ذہنی دباؤ عروج پر تھا۔ پریما بھی اس موقع پر ایک دن کے لیے آئی۔ پولیس کے عملے سے ملی۔ ان کی نااہلی پر دھمکیاں دیں، اور چلی گئی۔ ڈی آئی جی اور آئی جی تک نے

گھر کا معائنہ کیا۔ غفور کو مستقل طور پر لاک اپ میں بند کردیا گیا۔ ایس پی کے حکم پر تھانے دار (ایس ایچ او) نارائن مورتی کو ہدایت دی گئی کہ وہ خود رات جسٹس سنگھ کے گھر پر گزارے۔ تھانے دار نارائن مورتی خود بہت پریشان تھا۔ معمہ سلجھنے میں ہی نہیں آرہا تھا۔ ایک رات وہ کوٹھی کے برآمدے میں بیٹھا تھا۔ تھک گیا تو سوچا ذرا ٹہل لے۔ جسٹس سنگھ کے کمرے میں روشنی دیکھ کر ٹھٹھک گیا اور ایک طرف مہندی کی باڑ کی آڑ میں کھڑا ہوگیا۔ باتھ روم کا پچھلا دروازہ آہستہ سے کھلا اور جسٹس سنگھ باہر نکلے۔ ان کے ہاتھ میں کچھ تھا۔ سبک قدموں سے چلتے ہوئے وہ نیم روشن پائیں باغ کی طرف بڑھے۔ نارائن بھی بے آواز قدموں سے ان کے پیچھے چلتا رہا۔ باغ کے ایک کنج میں نیم، آم اور جامن کے بڑے بڑے درخت تھے۔ وہاں پہنچ کر جسٹس سنگھ ایک درخت کے نیچے بیٹھ گئے۔ ہاتھ میں پکڑی ہوئی کھرپی سے درخت کی جڑ میں زمین کھودنے لگے۔ نارائن سانس روکے ہوئے قریب ہی کھڑا استعجاب کے سمندر میں غرق یہ نظارہ دیکھ رہا تھا۔ سنگھ صاحب نے جیب سے ایک پوٹلی نکال کر گڈھے میں رکھی اور مٹی ڈالنے ہی والے تھے کہ نارائن نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ٹارچ کی روشنی ڈالی۔ سنگھ کی آنکھیں بند تھیں۔ ”صاحب۔ جسٹس سنگھ، یہ آپ کیا کررہے ہیں؟“ نارائن نے زور سے ان کا کندھا ہلایا۔ جسٹس سنگھ نے چونک کر آنکھیں کھولیں اور جیسے ہوش میں آگئے۔

”کیا ہے؟“ وہ گھبرا کر بولے۔ چاروں طرف اندھیرے میں نظریں دوڑائیں۔ خوف زدہ ہوکر پوچھا: ”کیا ہوا؟ مجھے تم یہاں کیوں لائے ہو؟ یہ سب کیا ہورہا ہے؟“ انھوں نے اٹھنے کی کوشش کی تو نارائن نے گڈھے میں رکھی ہوئی پوٹلی پر ٹارچ ڈالتے ہوئے کہا: ”یہ تو آپ ہمیں بتائیں گے سر کہ یہ سب کیا ہے؟ اس پوٹلی میں کیا ہے؟ اور آپ اسے زمین میں کیوں گاڑھ رہے ہیں۔“ نارائن نے پوٹلی اٹھائی اس میں سونے کے زیورات تھے جو انھوں نے بیٹی کے لیے خریدے تھے۔

جسٹس سنگھ پوری طرح ہوش میں آچکے تھے۔ ”کیا بکواس ہے۔ مجھے سوتے میں اٹھا کر یہاں کیوں لایا گیا ہے اور یہ زیورات کون لایا ہے۔“ ان کے قدم غصے اور اعصابی تناؤ سے کانپ رہے تھے۔

نارائن نے کہا”سر آپ خود آئے ہیں اور یہ زیور بھی آپ ہی یہاں دفن کررہے تھے۔“ نارائن نے جھاڑیوں میں چھپ کر جسٹس سنگھ کی حرکات وسکنات کا پورا ویڈیو بنالیا تھا۔ اس نے ایس پی صاحب کو فون کرکے فوراً پہنچنے کی درخواست کی۔ ایمرجنسی تھی اور معاملہ ہائی کورٹ کے جسٹس کا تھا۔ جسٹس سنگھ بے ہوش ہوچکے تھے۔ گارڈز کی مدد سے انھیں کوٹھی میں پہنچایا گیا۔ تھوڑی دیر میں ایس پی صاحب پہنچ گئے۔ نارائن نے سارا واقعہ ان کے گوش گزار کیا۔ ڈاکٹر کو فون کیا گیا اور اسی وقت سرچ لائٹ لگا کر درخت کے آس پاس کی زمین کھدوائی گئی۔ مختلف مقامات پر چوری کا سارا سامان، سونے کا مجسمہ، گھڑیاں اور پانچ ہزار روپے کی گڈی برآمد کرلی گئی۔

جسٹس سنگھ سائیکٹرسٹ کے زیر علاج ہیں۔ پریما اور رشمی بھی پہنچ گئی تھیں۔ ڈاکٹر کی رپورٹ نے نفسیاتی مرض Sleep walking with mental anxiety کی تشخیص کی ہے جس کی بنا پر جسٹس سنگھ کو ایک سال کی چھٹی پر بھیج دیا گیا ہے۔ پریما اور رشمی واپس جاچکی ہیں، لیکن غفور نے نمک حلالی کا حق ادا کرتے ہوئے ان کا ساتھ نہیں چھوڑا ہے۔

افسانچہ

اُف! یہ مصیبت کا پہاڑ

افسانچہ

ڈاکٹر اظہر حیات

(ناگپور)

کالج کا کلرک ایک طالبہ کے ہمراہ میرے آفس میں داخل ہوا۔ اس نے آتے ہی قدرے ترش لہجے میں کہا سر، اس بچی نے ایڈمیشن فیس بھی پوری نہیں بھری ہے اور ریگولر کلاس بھی اٹینڈ نہیں کرتی ہے۔ اب ایگزام فارم بھرنے آئی ہے۔ میں نے اس بچی کی طرف دیکھا وہ دبلی پتلی اور نحیف سی لڑکی تھی۔ میں نے پوچھا، بیٹی! کونسے ائیر میں پڑھتی ہو۔ اسنے نہایت آہستہ سے کہا سر ہم بی اے فرسٹ ائیر میں ہیں۔ پوچھا آپ نے ایڈمیشن فیس پوری کیوں نہیں بھری اور کالج ریگولر کیوں نہیں آتی ہو۔ اس نے آہستہ سے کہا ہماری خالہ کامٹی میں رہتی ہیں ہم ان کے گھر چلے گئے تھے۔ پوچھا کیوں؟ اس نے کہا ہمارے خالو کا انتقال ہوگیا تھا، خالہ اکیلی رہ گئی تھیں تو ہماری امی نے ہم کو ان کی مدد کے لئے وہاں بھیج دیا تھا۔ میں نے کہا، کیا ان کی کوئی اولاد نہیں ہے؟ اس نے کہا خالہ کا آٹھ سال کا ایک بیٹا ہے مگر وہ پیدائشی اپاہج اور کم دماغ ہے۔ کہا تم کب تک وہاں رہوگی؟ اس نے کہا سر، ہم اب اپنے گھر آ گئے ہیں۔ میں نے کہا کیوں؟ سر ہمارے والد صاحب کا انتقال ہوگیا تو ہم واپس آ گئے۔ میں چونک گیا۔ کہا آپ کے والد صاحب کا انتقال کیسے ہوا؟ اس نے اپنے دوپٹے سے آنسو پونچھتے ہوئے کہا سر ہمارے ابو سائیکل سے جارہے تھے تو ٹرک سے ایک گیہوں کی بوری ان کے سر پر گر گئی۔ ان کی گردن پر اس قدر زور کا جھٹکا لگا کہ انھوں نے وہیں پر دم توڑ دیا۔ میرا سر چکرانے لگا۔ میں بھیگی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر میں نے اس سے سوال کیا، بیٹی آپ کے گھر کا خرچ کیسے چلتا ہے؟ اس نے کہا سر ہماری امی مزدوروں کے لیے کھانا بنا کر ڈبے میں انھیں دیتی ہیں۔ کتنے ڈبے وہ روزآنہ مزدوروں کو دیتی ہیں۔ کہنے لگی ہمارے ابا تھے تو پندرہ بیس ڈبے جاتے تھے مگر ابو کے انتقال کے بعد ہماری امی کو لقوہ مار دیا وہ بھی اپاہج ہوگئی ہیں۔ یہ سن کر میری آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔ میں نے بچی سے کہا بیٹی کرسی پر بیٹھ جاؤ۔ وہ بیٹھ گئی۔ پھر پوچھا بیٹی یہ بتاؤ آپ کے کتنے بھائی بہن ہیں۔ اس نے کہا ہم کو بھائی نہیں ہے، ہم سے بڑی ایک بہن ہے۔ مگر بارھویں پاس ہونے کے بعد آگے نہیں پڑھ سکی وہ امی کا ہاتھ بٹاتی ہیں۔ میں نے پوچھا، کامٹی والی آپ کی خالہ کیسی ہیں۔ اس نے کہا امی نے ان کے اپاہج بیٹے اور خالہ کو اپنے پاس بلا لیا ہے۔ میں سوچ رہا تھا یا اللہ ان معصوموں پر آزمائشوں کا یہ کیسا پہاڑ ہے۔

بیل بجائی اور چپراسی سے پینے کا پانی منگوایا۔ اس بچی کو بھی ایک گلاس دیا۔ کلرک نے بھی پانی پیا اور میں نے بھی چند گھونٹ پی لیے۔

کلرک سے کہا اس بچی کی ساری فیس ہم بھر دیں گے اور کلرک کو جانے کا اشارہ دیا۔ کلرک باہر چلا گیا۔ اب بچی اکیلی بیٹھی تھی۔ میں نے پاکٹ سے ایک ہزار روپیے نکالے اور اسے یہ کہہ کر دیئے کہ اپنی امی کو دے دینا۔ اور آپ اگزام کی اچھی تیاری کرو۔

دوسرے دن وہی بچی ایک لڑکی کے ہمراہ آفس کے دروازے پر اندر آنے کی اجازت طلب کر رہی تھی" مے آئی کم ان سر" میں نے کہا کم ان۔ وہ دونوں اندر آ گئیں۔ بڑی لڑکی نے آتے ہی اپنا تعارف دیا۔ سر میں اس کی بڑی بہن ہوں۔ یہ اسی کالج میں فرسٹ ائیر میں زیر تعلیم ہے۔ ہم کو ہماری امی نے بھیجا ہے یہ پوچھنے کے لیے کہ کل ایک ہزار روپیے کیا آپ نے دئے تھے؟ میں نے کہا ہاں بیٹی میں نے ہی دیے تھے آپ لوگوں کی مدد کی غرض سے۔ اس نے کہا امی کہتی ہیں بغیر محنت سے آئے پیسوں میں برکت نہیں ہوتی ہے۔

میں انھیں دیکھتا ہی رہ گیا اور سوچ رہا تھا غربت ان کے لباس میں ہے مگر خودداری ان کے کردار میں۔

افسانچہ

کچھ سست قدم رستے

یہ کہانی ہے ایک ماں کی۔۔۔
جو دُنیا کے ظلموں میں بھی محبت کا سفر کرتی رہی

مسرور تمنا
(پونے)

پچاس روپیے کا گوشت دینا۔

اچھا ! گوشت والے نے گھور کر دیکھا، پہلے کا باقی تو دیا نہیں۔

بس آج پھر ادھار دے دو ، گلزار لڑکھڑاتے ہوئے گوشت کی طرف للچاتی نظروں سے دیکھ رہا تھا۔

اسے پتا تھا گھر میں باسی روٹی یا ابلے چاول کے علاوہ کچھ بھی نہ ہوگا۔

اور ادھر جنت بھی پرانے پھٹے کپڑوں میں لپٹی اپنے پھولے وجود کو دیکھ رہی تھی۔

ایک ہفتے سے پیٹ بھر کھانا نہیں ملا پھر بھی وہ مری نہیں، نا ہی اسکے پیٹ کا، بچہ وہ تو مزے سے اسے لات مار رہا تھا۔

اس دنیا نے اور گلزار نے کیا کم مارا تھا۔

مگر اپنے بچے سے اسے پیار تھا ممتا تھی، جو لات مارنے پر کھل اُٹھتی تھی۔

ماں نے تو جنت نام اس لیئے رکھا تھا کے وہ دنیا میں ہی جنت کے مزے لے، مگر پھوٹی قسمت، نہ چاہ کر بھی گلزار سے بیاہ دیا۔

گلزار اکیلا تھا۔ سوچا چلو سسرال میں سب اسی کا ہوگا۔مگر گلزار کی بری عادت نے اسے برباد کر دیا۔

جنت کی ماں مرگئ اور جنت اپنا پھولا پیٹ لے کر دوسروں کا کام کرتی، ماں کا سب کچھ گلزار نے اڑا دیا۔رات وہ درد سے کراہ رہی تھی۔

تبھی گلزار پاس آیا، ماں کی اخری نشانی کان کی بالیاں نوچ لے گیا۔

جنت اپنی بے گناہی کے باوجود جیتے جی جہنم میں جل رہی تھی۔ یا خدا میں اپنے لیے نہیں اس کوکھ میں پلتے وجود کے لیے کچھ کھانا چاھتی ہوں......

اور وہ بےھوش ہوگئ۔

پڑوس کی ساتھی رانی نے اسکی حالت دیکھی۔

ہائے ہائے ربا! تو یہاں بیٹھا شراب پی رہا ہے تیری بیوی کی حالت خراب ہے چل اسپتال لے چل،

میرے پاس پیسہ نہیں گاڑی کا کرایہ نہیں ہے۔

ہاں رے نکما کام چور بیوی کی کمائی کھانے والا، پڑا رہ مر۔۔۔

سیما،نسرین، دادی، چاچا سب آو، جنت کو لے چلو۔

اب وہ اسپتال میں تھی۔.XX خدا خدا کر کے اس نے آنکھیں کھولیں، اسکی کمزور نگاہیں اپنے بچے اور گلزار کو ڈھونڈ رہیں تھیں مگر اسکی کوکھ اجڑ چکی تھی وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی، اتنے لات کھا کر خوش ہوتی تھی، بچہ مگر وہ تو مجھے چھوڑ گیا، اب میں زندہ رہ کر کیا کرونگی، میرے جینے کا مقصد کیا ہے۔

ڈاکٹر شاھین نے اسے ہمت دی، کچھ دن میرے گھر آرام کرو۔پھر تم اپنے کام پر لگ جانا، ڈاکٹر دانش سے میری بات ہو چکی ہے۔

رانی نے بتایا جس دن وہ اسپتال آئی تھی گلزار کہیں بھاگ چکا تھا۔

وہ اسپتال میں لوگوں کی خدمت کر کے وقت گذارتی رہی، ابھی وہ ایک مریض کے پاس تھی، تبھی کسی نے اسے پکارا،سسٹر بیڈ نمبر چھ کا مریض بہت بری حالت میں ہے، ڈاکٹر شاھین نے آپ کو بلایا ہے۔

جنت نے اس مریض کو دیکھا جو خون کی الٹیاں کرتے کرتے تھک چکا تھا۔

جنت پر اسکی نگاہ رکی تو وہ چونکا جنت۔ارے نہیں وہ تو برسوں پہلے مر چکی بھوک سے، میرے ظلم سے، پھر وہ زور سے ہنستا رہا، اور اخری اُلٹی کر کے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے خاموش ہوگیا۔

جنت نے اپنے پرس سے روپیے نکالے، سسٹر اسکے کفن کا انتظام کر دو۔

اور اسکی آنکھوں میں آئے آنسو کہیں اندر جا کر گم ہو گئے۔

غزلیں

مدھوش بلگرامی

(بہرا سوداگر۔ ہردوئی)

دُھوپ نیزے اگر ڈراتے ہیں
سائے بھی کب مجھے بچاتے ہیں

دن کیا ایسے بدل بھی جاتے ہیں
باپ کو بچے آزماتے ہیں

ہر طرف جس نامرادی ہے
جھونکے پھر بھی ہوا کے آتے ہیں

طول ہوجاتی ہیں مری راتیں
جب وہ حالِ قفس سناتے ہیں

سرحدیں میری بھی تمام ہوئیں
قافلے کیوں بچھڑے جاتے ہیں

خوش ہُوں خانہ بدوش ہوکر بھی
خواب گھر کے مگر ستاتے ہیں

خط تمہارا وہ آج بھی مدھوش
کتنی ترتیب سے سجاتے ہیں

ڈاکٹر نبیل احمد نبیل

میں رہ گزارِ عشق پہ اُس مرحلے میں تھا
یادوں کا کوئی عکس کہاں آئنے میں تھا

جس پر نشانِ منزلِ ہستی نہ کُھل سکا
میں بھی اے میرے دوست اُسی قافلے میں تھا

جاگی نہیں تھی دل میں محبت کی آرزو
سینے میں ایک ایک نَفَس قاعدے میں تھا

پھر بھی زمانہ روند کے مجھ کو گزر گیا
ہر ہر قدم اگرچہ مرا دائرے میں تھا

آنکھیں تو مل گئیں تہیں کبھی دل نہ مل سکے
میرے قریب رہ کے بھی وہ فاصلے میں تھا

جیسے کسی غریب کی بیٹی کا بین ہو!
تازہ ہَوا کا شور عجب غم کدے میں تھا

تشنہ دہانِ غم کی تسلّی کے واسطے
ساقی نہ کوئی جام کہیں میکدے میں تھا

اوراقِ زندگی پہ جو کھینچا گیا نبیل
شامل مرا لہو بھی اُسی حاشیے میں تھا

ڈاکٹر قمر سُرور

(احمد نگر۔مہاراشٹرا)

کچھ بھی کیجئے جناب ناممکن
لوٹ آئے شباب ناممکن

ہم تو ہر حال میں تمہارے ہیں
ہم کریں اجتناب، ناممکن

اس کی نظرِ کرم جو ہوجائے
کچھ نہیں ہے جناب، ناممکن

جو خزاں میں بھی مسکراتا ہے
اس کو کہہ دوں گلاب ناممکن

جو تری آنکھ سے چھلکتی ہے
اس سے اچھی شراب ناممکن

میری مسکان کے عوض وہ کبھی
مجھ کو بھیجے گلاب نا ممکن

اس کی آنکھوں نے ایسا خط لکھا
جس کا مجھ سے جواب ناممکن

اک ترے ذکر کے بنا میری
ہو مکمل کتاب ناممکن

ظلم اپنے عروج پر ہو قمر
اور نہ آئے عذاب نا ممکن

غزلیں

سلیم کاوش

رَمزِ تخلیق کی غایَت سے عطا ہوتا ہے
عِشق خود اپنی رِعایَت سے عطا ہوتا ہے

عِشق حَیثیتِ فَردی کا نہیں ہے قائل
عِشق تو جَذب و سَرایَت سے عطا ہوتا ہے

پیار جذبات کا بے سَمت سَفَر ہے لیکن
عِشق منزِل کی ہِدایَت سے عطا ہوتا ہے

عِشق تسلیم و رضا صبر سے مَوسُوم مگر
عِشق اوصافِ وِلایَت سے عطا ہوتا ہے

عِشق کرنا ہے تو بے شِرک محَبَّت کرنا
عِشق کب حَرف وحِکایَت سے عطا ہوتا ہے

عِشق ہر شخص کی خواہش تو رہا ہے کاوِش
عِشق توفیق و عِنایَت سے عطا ہوتا ہے

سلیم محی الدین

تجربوں سے گزر رہا ہوں میں
اپنے اندر اُتر رہا ہوں میں

دیکھیے تو بکھر رہا ہوں میں
درحقیقت سنور رہا ہوں میں

یہ کوئی خواب تو نہیں لیکن
میں نے دیکھا گزر رہا ہوں میں

وہ مجسم ہے روبرو میرے
عکس میں رنگ بھر رہا ہوں میں

حادثہ اس لیے شدید لگا
اس کے دل سے اتر رہا ہوں میں

ہم بچھڑ کر بھی رابطے میں ہیں
ہاں ابھی بات کر رہا ہوں میں

اس کا واجب ہے مشتعل ہونا
وہ سمجھتا ہے ڈر رہا ہوں میں

پھر اچانک بدل گیا موسم
پھر تمہیں یاد کر رہا ہوں میں

لوگ نظریں بچھائے بیٹھے ہیں
زینہ زینہ اتر رہا ہوں میں

وہ بھی محسوس کر رہا ہوگا
اس کو اگنور کر رہا ہوں میں

فوزیہ اختر ردا

(کولکاتا)

سب کے اذہان میں جو پستی ہے
کیا یہ اردو کی سرپرستی ہے؟

پیار جس جا پنپ نہیں پایا
"یہ وہی آرزو کی بستی ہے"

چیز دنیا میں جو بھی سستی ہے
چیز واحد وہ زر پرستی ہے

جسم بھی آگ میں جُھلستا ہے
روح یہ پیار کو ترستی ہے

ہو نہ غلطی پہ کیوں پشیماں تُو
تیری فطرت میں ہی تو مستی ہے

اب تشخص نہ یہ مٹا ڈالے
یہ جو فطرت میں خود پرستی ہے

جنگ خود سے ہو کب تلک آخر
جبکہ ذہنوں میں حق پرستی ہے

دل نہ توڑو خدا کا گھر ہے یہ
دل پہ رحمت رِدا برستی ہے

تبصرہ

جشن آزادی اور تاریخ کے حاشیے پر کھڑی عورت

ڈاکٹر رفیعہ نوشین
(حیدرآباد، ہندوستان)

پندرہ روزہ آن لائن "اردو گلبن" کے آزادیٔ ہند نمبر پر ایک نظر

پندرہ روزہ آن لائن اردو ’’گلبن جدہ‘‘، کے مدیرِ اعلیٰ جناب مہتاب قدر صاحب نے ماہِ اگست میں خصوصی ” آزادی ہند نمبر“ شائع کیا- شمارہ ہاتھ میں آتے ہی نہیں، بلکہ سرورق پر نظر پڑتے ہی دل باغ باغ ہوگیا- ترنگے کے رنگوں سے آراستہ سرورق، ہندوستان کی تاریخی عمارتوں کے دل فریب عکس، اور آزادی کی فضا میں پرواز کرتے ہوئے امن کے پرندے سب مل کر ایک ایسا بصری استعارہ تخلیق کرتے ہیں جیسے رسالے کا ہر ورق خود آزادی کا ترانہ بن گیا ہو۔

یہ محض ایک رسالے کا سرورق نہیں، بلکہ ایک عہد کی یاد، ایک تہذیب کی خوشبو اور ایک قوم کی طویل جدوجہد کا تصویری دیباچہ محسوس ہوتا ہے۔

شمارے کے ابتدائی صفحات ہی پر 1857ء کی پہلی جنگِ آزادی کے جانبازوں رانی لکشمی بائی، بیگم حضرت محل، تانتیا ٹوپے، بہادر شاہ ظفر، منگل پانڈے اور نانا صاحب کے نام سے جاری کیے گئے ڈاک ٹکٹوں کے عکس دیکھ کر خوشی ہوئی۔ ڈاک ٹکٹ بظاہر کاغذ کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہوتا ہے، مگر کبھی کبھی یہی ننھا سا ٹکڑا تاریخ کا ایک پورا باب اپنے اندر سمیٹ لیتا ہے۔ ان ٹکٹوں کا شمارے میں شامل ہونا دراصل ان کرداروں کو قومی حافظے میں محفوظ رکھنے کی ایک خوب صورت کوشش ہے۔

مگر اسی مقام پر ایک سوال بھی دل کے دروازے پر دستک دیتا ہے۔

جب ہم آزادی کی تاریخ لکھتے ہیں تو کیا ہماری نظر صرف ان کرداروں تک محدود رہنی چاہیے جن کے نام سرکاری دستاویزات، سیاسی تاریخوں اور جنگی واقعات میں نمایاں حروف سے ثبت ہیں؟ یا ہمیں ان خاموش کرداروں کی طرف بھی پلٹ کر دیکھنا چاہیے جنھوں نے تاریخ کے صفحات پر اپنے نام تو نہیں لکھے، مگر تاریخ بنانے والوں کے لیے اپنے گھر، اپنے سکون اور اپنی زندگی کے دروازے کھول دیے تھے؟

اسی سوال کی بازگشت مجھے اس شمارے میں شامل ریشمی رومال تحریک سے متعلق مضمون پڑھتے ہوئے بھی سنائی دی۔

ریشمی رومال تحریک کے محفوظ اور معروف تحقیقی ریکارڈ میں خواتین کا براہِ راست اور نمایاں کردار یقیناً بہت کم دکھائی دیتا ہے، لیکن اس خاموشی کو عورت کی عدمِ شرکت کا قطعی ثبوت

گھر کی ذمہ داریوں کا وہ بوجھ اپنے کندھوں پر اٹھائے رکھا جس کے باعث مزاحمت میں شریک مرد اپنے مقصد کی طرف یکسو ہو سکے۔

تاریخ کے رسمی ریکارڈ میں ایسی قربانیاں اکثر نام، تاریخ اور عنوان کے بغیر رہ جاتی ہیں۔

مگر ایک اصول ہمیں ہمیشہ پیشِ نظر رکھنا چاہیے:

دست میں، اور کبھی اپنے بچوں کو یہ بتانے والی ماں بن کر کہ ان کے باپ نے آزادی کے لیے قربانی دی ہے۔

یہ بھی تاریخ ہے- اگرچہ اسے تاریخ کو کتابوں میں کم ہی لکھا گیا۔

شمارے میں ایک مضمون کا عنوان ہے "گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور پٹیل- جدوجہدِ

معمار صرف وہی ہوتا ہے جو اینٹ اٹھا کر عمارت کی دیوار کھڑی کرے، یا وہ بھی جو اس تعمیر کے لیے زمین ہموار کرے، چراغ جلائے، وسائل فراہم کرے، حوصلہ دے اور طویل انتظار کی اذیت برداشت کرے؟ اگر آزادی کی تحریک ایک عظیم عمارت تھی تو اس کی بنیادوں میں عورت کی خاموش اینٹوں کو تلاش کرنا بھی تاریخ نویسی کی ذمہ داری ہے۔

سمجھ لینا تاریخ کے ساتھ انصاف نہیں ہوگا۔ اس عہد میں کتنی ہی عورتیں ایسی رہی ہوں گی جنھوں نے نہ کسی سیاسی تنظیم کی رکنیت اختیار کی، نہ کسی جلسے کی صدارت کی، نہ ان کے نام کسی سرکاری فہرست میں درج ہوئے؛ مگر انہوں نے اپنے گھروں کو ان مردوں کے لیے محفوظ پناہ گاہ بنائے رکھا جو خفیہ مزاحمتی سرگرمیوں میں مصروف تھے۔

اُنہوں نے شوہروں، بھائیوں اور اہلِ خانہ کی جدوجہد میں حوصلہ بخشا، گرفتاریوں، معاشی مشکلات اور سماجی دباؤ کا سامنا کیا، اور

"ریکارڈ میں کسی کردار کا کم دکھائی دینا لازماً اس کردار کے غیر موجود ہونے کی دلیل نہیں ہوتا"۔

یہی وہ نکتہ ہے جسے آزادی کی تاریخ لکھنے والوں کو نئے سرے سے سمجھنے کی ضرورت ہے۔

عورت کی شرکت ہمیشہ جلوس کے اگلے دستے میں، سیاسی جلسے کے اسٹیج پر یا قید و بند کی فہرست میں دکھائی نہیں دیتی۔ کبھی وہ گھر کی دہلیز پر کھڑی ہوتی ہے، کبھی چولہے کے پاس، کبھی کسی قیدی کی منتظر آنکھوں میں، کبھی اپنے زیور بیچ کر تحریک کے لیے رقم فراہم کرنے والی خاموش

آزادیِ ہند کے چار مختلف مگر باہم مربوط جہتوں کے نمائندے۔" ظاہر ہے، عنوان ہی بتا دیتا ہے کہ مضمون کا محور یہی چار شخصیات ہیں، اور یہ بالکل فطری بھی ہے۔

لیکن مضمون کی تمہید میں جب یہ کہا جاتا ہے کہ آزادی کی تحریک میں سیاسی رہنماؤں، علماء، دانش وروں، صحافیوں، طلبہ، مزدوروں، کسانوں اور "خواتین" نے اپنے اپنے انداز میں حصہ لیا تو دل ایک لمحے کو ٹھٹھک جاتا ہے۔

خواتین کا ذکر ہوا، مگر پھر وہ کہاں گئیں؟ نہ ان کے نظریات پر گفتگو، نہ ان کے

سیاسی شعور کا ذکر، نہ ان کے خوابوں اور قربانیوں کا بیان، نہ ان کے تصورِ آزادی کی کوئی جھلک۔ یوں محسوس ہوتا ہے جیسے عورت کو تاریخ کے دروازے تک لا کر پھر آہستگی سے حاشیے پر کھڑا کر دیا گیا ہو۔

سوال یہ نہیں کہ گاندھی، نہرو، مولانا آزاد اور پٹیل کی خدمات کیا تھیں۔ سوال یہ ہے کہ کیا آزادی صرف مردوں کا خواب تھی؟

کیا عورتوں نے آزادی کو محسوس نہیں کیا؟

کیا ان کے لیے غلامی کی زنجیریں محض سیاسی مسئلہ تھیں اور ذاتی آزادی کا کوئی مفہوم نہیں تھا؟

اور آخر کب تک ہم عورت کو ہر میدان میں موجود ہونے کے باوجود تاریخ کے بیانیے میں غیر موجود سمجھتے رہیں گے؟

اسی نوعیت کا ایک مضمون "برصغیر کی جدوجہدِ آزادی میں مسلمانوں اور علماء کا کردار" بھی ہے۔ علماء اور مسلم رہنماؤں کی جدوجہد کا ذکر یقیناً ضروری ہے، لیکن کیا اس جدوجہد کی سماجی بنیادوں میں عورتوں کی کوئی جگہ نہ تھی؟

جن مردوں نے آزادی کی تحریک میں حصہ لیا، ان کے پیچھے گھر کس نے سنبھالے؟

ان کی غیر موجودگی میں بچوں کی پرورش کس نے کی؟

گھر کے معاشی اور معاشرتی مسائل کا بوجھ کس نے اٹھایا؟

اور جب شوہر، بھائی یا بیٹا گرفتاری کے خطرے سے دوچار تھا تو اس کے گھر کی دہلیز پر کھڑے خوف اور انتظار کو کس نے جھیلا؟

کیا کسی مقصد کے لیے کسی انسان کو ذہنی، جذباتی اور عملی سہارا فراہم کرنا جدوجہد نہیں؟

ایک اور مضمون کا عنوان ہے: ''علمائے ہند، مذہبی شناخت کے محافظ اور تحریکِ آزادی کے معمار۔''

یہاں بھی ایک سوال بے اختیار ابھرتا ہے

کیا مذہبی شناخت کے محافظ صرف مرد ہوتے ہیں؟

اور کیا تحریکِ آزادی کے معماروں میں خواتین کا شمار نہیں ہوتا؟

معمار صرف وہی ہوتا ہے جو اینٹ اٹھا کر عمارت کی دیوار کھڑی کرے، یا وہ بھی جو اس تعمیر کے لیے زمین ہموار کرے، چراغ جلائے، وسائل فراہم کرے، حوصلہ دے اور طویل انتظار کی اذیت برداشت کرے؟ اگر آزادی کی تحریک ایک عظیم عمارت تھی تو اس کی بنیادوں میں عورت کی خاموش اینٹوں کو تلاش کرنا بھی تاریخ نویسی کی ذمہ داری ہے۔

شمارے کی ایک نہایت قابلِ تحسین خصوصیت مختلف صفحات پر شائع کیے گئے مجاہدینِ آزادی کے 51 نادر و نایاب یادگاری ڈاک ٹکٹ ہیں۔ یہ ٹکٹ محض تصویری آرائش نہیں بلکہ ہندوستان کی آزادی کی جدوجہد کے کرداروں کو قومی حافظے میں محفوظ رکھنے کی ایک مؤثر کوشش ہے۔

خصوصاً مرزا محمد نواب، جدہ، کا مضمون "مجاہدینِ آزادی پر ٹکٹ" اس حوالے سے خاص توجہ کا مستحق ہے۔ مضمون کا بنیادی سوال ہی اپنے اندر ایک پوری تاریخ کا درد سمیٹے ہوئے ہے:

''کیا آج کا ہندوستان اور میرے ہم وطن ان مجاہدینِ آزادی اور آزادی کی تحریکوں سے واقف ہیں؟''

یہ سوال دراصل ہمارے اجتماعی حافظے کا امتحان ہے۔

مصنف نے انڈیا پوسٹ کے ذریعے وقتاً فوقتاً جاری کیے گئے منتخب اور نمایاں مجاہدینِ آزادی کے یادگاری ڈاک ٹکٹ نہ صرف پیش کیے ہیں بلکہ ان کے بارے میں معلومات بھی فراہم کی ہیں۔ ان کا یہ جملہ خاص طور پر قابلِ غور ہے کہ "آزادی کی جنگ میں بے شمار لوگوں نے حصہ لیا، لیکن ہم گنتی کے چند لوگوں کو ہی یاد کرتے ہیں۔"

یقیناً یہی ہماری تاریخ کا ایک بڑا المیہ ہے۔

اور اسی المیے کے اندر عورت کی گم شدہ تاریخ بھی پوشیدہ ہے۔

یہ بات خوش آئند ہے کہ ان ٹکٹوں میں وِجے لکشمی پنڈت، سبھد را جوشی، رانی رانی گائد نلیو، میرا بہن، بیگم حضرت محل، کملا نہرو اور اینی بیسنٹ جیسی خواتین بھی شامل ہیں۔ ان خواتین کے یادگاری ٹکٹ نہ صرف شمارے کی قدر و قیمت بڑھاتے ہیں بلکہ یہ بھی یاد دلاتے ہیں کہ آزادی کی داستان صرف چند مرد ناموں کی داستان نہیں تھی۔

اندرونی صفحات پر آزادیِ ہند کے یادگاری ٹکٹوں کا یہ خزانہ تقریباً ہر صفحے پر بکھرا ہوا ہے۔ کہیں ایک چہرہ ماضی کی کسی بھولی ہوئی گلی سے ہمیں آواز دیتا ہے، کہیں کوئی نام اپنی شناخت کا حق مانگتا ہے اور کہیں کوئی تصویر سوال کرتی محسوس ہوتی ہے کہ کیا تم ہمیں اب بھی یاد رکھتے ہو؟

"گلبن جدہ" کا یہ آزادی ہند نمبر مجموعی طور پر ایک قابلِ قدر اور مبارک کاوش ہے۔ اس میں تاریخ، سیاست، صحافت، علماء، مجاہدین اور تحریکِ آزادی کے مختلف پہلوؤں کو سمیٹنے کی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ مگر ایک ادیب اور عورت ہونے کے ناتے میں اس شمارے سے ایک سوال بھی وابستہ کرنا چاہتی ہوں۔

جب ہم آزادی کی بات کریں تو کیا ہم آزادی کے نصف آسمان کو بھول سکتے ہیں؟

ہندوستان کی آزادی صرف میدانِ جنگ میں لڑی جانے والی جنگ نہیں تھی۔ یہ گھروں میں بھی لڑی گئی، دلوں میں بھی، دعاؤں میں بھی، آنسوؤں میں بھی، انتظار میں بھی اور قربانیوں میں بھی۔

اس جنگ میں کچھ عورتیں تلوار لے کر نکلیں، کچھ نے قلم اٹھایا، کچھ نے جیلیں کاٹیں، کچھ نے سیاسی تحریکوں میں حصہ لیا، کچھ نے زیرِ زمین سرگرمیوں میں تعاون کیا؛ اور بہت سی ایسی تھیں جن کے نام تک تاریخ نے محفوظ نہیں کیے۔

لیکن نام کا نہ ہونا کردار کے نہ ہونے کی دلیل نہیں۔

ہمیں تاریخ کے ان خاموش دریچوں کو بھی کھولنا ہوگا جہاں عورت کی قربانی کسی عنوان کے بغیر پڑی ہے۔

آج جب ہم آزادی کا جشن مناتے ہیں تو ضروری ہے کہ ہم صرف ان مجاہدین کو سلام نہ کریں جن کے نام ہمارے نصابوں اور تقریروں میں محفوظ ہیں، بلکہ ان گمنام عورتوں کو بھی یاد کریں جنھوں نے آزادی کی قیمت اپنے سکون، اپنے گھر، اپنے رشتوں اور کبھی کبھی اپنی پوری زندگی سے ادا کی۔

"آزادی کی تاریخ اس وقت تک مکمل نہیں ہو سکتی جب تک اس میں مرد کے ساتھ عورت کی آواز بھی سنائی نہ دے۔"

اور جب بھی کوئی قلم کار آزادی کی بات کرے تو اس پر یہ اخلاقی ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ تاریخ کے روشن میناروں کے ساتھ ان چراغوں کا بھی ذکر کرے جو خاموشی سے جلتے رہے۔

کیونکہ آزادی کسی ایک جنس کی میراث نہیں۔

"یہ ایک پوری قوم کا خواب تھا، اور اس خواب کی تعبیر میں عورت کا حصہ بھی اتنا ہی حقیقی ہے جتنا مرد کا۔"

"گلبن جدہ" کے اس خوب صورت آزادی ہند نمبر کے لیے مدیرِ اعلیٰ جناب مہتاب قدر اور پوری ادبی ٹیم مبارک باد کی مستحق ہے۔ امید ہے کہ آئندہ ایسے شماروں میں آزادی کی تاریخ کے ان گوشوں کو بھی مزید جگہ ملے گی جہاں عورت محض ایک لفظ نہیں بلکہ کردار، قربانی، شعور اور مزاحمت کی ایک مکمل داستان بن کر موجود ہے۔

اُردو کے خاموش چراغ

کامل جنیٹوی سے موبائل پر فکر انگیز نشست

یاسمین اختر طوبیٰ
(گوجرانوالہ۔ پاکستان)
(گوجرانوالہ۔ پاکستان)

پہلے مشاعرے تربیت گاہ ہوتے تھے، اب تفریح کا رنگ کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم اچھے شعرا آج بھی موجود ہیں اور اچھی روایت بھی باقی ہے۔

بعض چراغ ایسے ہوتے ہیں جن کے لیے کسی مینار کی بلندی ضروری نہیں ہوتی۔ وہ کسی شہر کے مرکزی چوراہے پر نصب نہیں کیے جاتے، نہ ان کے گرد تصویریں کھنچوانے والوں کا ہجوم ہوتا ہے۔ وہ گاؤں کی کسی خاموش گلی، کسی شکستہ دریچے یا کسی بے نام کمرے میں جلتے ہیں مگر ان کی روشنی دور تک سفر کرتی ہے۔ان چراغوں کی لو آنکھوں سے پہلے دلوں کو منور کرتی ہے۔

اردو بھی آج ایسے ہی چراغوں کی تلاش میں ہے۔

وقت کی تیز رفتار شاہراہ پر جہاں زبانیں بازار کی ضرورت بن رہی ہیں، وہاں اردو محبت کے چند کندھوں پر سفر کر رہی ہے۔ کبھی اس کے نصاب سکڑ جاتے ہیں، کبھی اس کی تختیاں اتر جاتی ہیں، کبھی اس کے بولنے والے کم ہو جاتے ہیں مگر ہر دور میں کہیں نہ کہیں، کوئی شخص خاموشی سے اس کی نبض پر ہاتھ رکھے بیٹھا رہتا ہے جیسے کوئی درویش مسجد کے بجھتے چراغ میں تیل ڈالتا رہے۔

ایسے ہی چراغوں میں ایک نام محترم کامل جنیٹوی صاحب کا بھی ہے۔

وہ نہ شہرت کی دوڑ میں شامل ہیں، نہ اعزازات کی چکاچوند نے انہیں اپنی طرف کھینچا۔ ایک چھوٹے سے قصبے جنیٹھ میں رہتے ہوئے نصف صدی سے اردو کی آبیاری میں مصروف ہیں۔

(قصبہ جنیٹھ جسے جنیا شریف بھی کہا جاتا ہے ہندوستان کی ریاست اتر پردیش کے ضلع سنبھل، جو پہلے ضلع مراد آباد کا حصہ تھی، میں چندوسی کے قریب واقع ایک معروف مقام ہے۔)

رسمی تعلیم مکمل نہ ہونے کے باوجود

مطالعہ، ریاضت، استاد کی تربیت اور مسلسل تخلیقی سفر نے انہیں حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ، تاریخی قطعات، اردو دوہا، ماہیہ، ہائیکو، رینگا اور تنکا جیسی اصناف میں معتبر شناخت عطا کی۔ ان کا کلام ہندوستان اور پاکستان کے متعدد ادبی جرائد میں شائع ہوا، آل انڈیا ریڈیو اور مختلف دوردرشن مراکز سے نشر ہوتا رہا لیکن ان سب کے باوجود ان کی شخصیت میں وہی انکسار ہے جو پھل دار

لہجے میں دیہات کی مٹی کی سادگی اور آنکھوں میں اردو کے لیے ایک ایسی محبت تھی جو کسی دعوے کی محتاج نہیں۔

یوں محسوس ہوا جیسے راقمہ کسی شاعر سے نہیں، ایک ایسے باغباں سے گفتگو کرنے جا رہی ہو جس نے عمر بھر پھولوں کی نہیں، زبان کی آبیاری کی ہو۔

مٹی، چراغ اور لفظوں کی ابتدا

سوال: قصبہ جنیٹہ آپ کے لیے صرف جائے

دکھائی دیتا ہے جو اندھیروں سے لڑنے کا اعلان نہیں کرتا، صرف خاموشی سے جلتا رہتا ہے۔ کیا آپ اپنی زندگی کو بھی اسی استعارے میں دیکھتے ہیں؟

جواب: شاید میری پوری زندگی اسی ایک بات میں سمٹ جاتی ہے۔ میں نے کبھی سورج بننے کی خواہش نہیں کی۔ میری کوشش صرف یہ رہی کہ میرے حصے کا اندھیرا کم ہو جائے۔ اگر میری وجہ سے

آن لائن مشاعروں نے فاصلے ختم کر دیے۔ آج ایک شاعر اپنے گھر سے پوری دنیا کے سامعین تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ معیار کو قربان نہ کیا جائے۔

درخت کی شاخوں میں ہوتا ہے۔

یہ گفتگو کسی ادبی کانفرنس کے شور میں نہیں ہوئی۔

نہ درمیان میں تالیوں کی آواز تھی، نہ اسٹیج کی چکاچوند۔

صرف ایک موبائل اسکرین تھی، دو سرحدوں کے درمیان پھیلا ہوا خاموش فاصلہ تھا اور اس فاصلے کے بیچ لفظوں کا ایک پل آہستہ آہستہ تعمیر ہو رہا تھا۔

اسکرین روشن ہوئی۔

چہرے پر برسوں کی ریاضت کا سکون،

پیدائش ہے یا آپ کی شاعری کی پہلی درسگاہ؟

جواب: میرے لیے جنیٹہ صرف ایک قصبہ نہیں، میری شناخت ہے۔ میری پہلی بارش، پہلی دھوپ، پہلی خوشبو، پہلی اذان، پہلی خاموشی، سب اسی مٹی سے وابستہ ہیں۔ شاعر اپنے ماحول سے الگ ہو کر کبھی مکمل نہیں ہو سکتا۔

سوال: کامل صاحب! اگر آپ کی پوری زندگی کو ایک داستان کا کردار مان لیا جائے تو مجھے آپ کی ذات میں ایک ایسا چراغ

کسی ایک نوجوان کے دل میں اردو کے لیے محبت پیدا ہو جائے تو یہی میرے لیے سب سے بڑا اعزاز ہے۔

سوال: آج جب اردو مختلف چیلنجز سے گزر رہی ہے، ایسے وقت میں آپ کو سب سے زیادہ کس بات کی فکر رہتی ہے؟

جواب: مجھے زبان کے مستقبل سے زیادہ اہلِ زبان کی بے توجہی کی فکر ہے۔ زبانیں دشمنوں سے نہیں مرتیں، اپنے لوگوں کی غفلت سے کمزور ہوتی ہیں۔ جب گھروں میں اردو بولی جائے گی، بچے

اردو پڑھیں گے اور کتابیں ہاتھوں میں آئیں گی تو زبان خود بخود زندہ رہے گی۔

سوال: آپ کی رسمی تعلیم مکمل نہ ہو سکی۔ کیا یہ احساس کبھی دل میں خلش بن کر رہا؟

جواب: ضرور رہا مگر میں نے اسے محرومی نہیں بننے دیا۔ کتابیں میری یونیورسٹی بن گئیں۔ مطالعہ، مشاہدہ اور اہلِ علم کی صحبت نے وہ خلا بڑی حد تک پر کر دیا۔

کیونکہ شعر زبان کی نہیں، کردار کی بھی پہچان ہوتا ہے۔ اس سے بڑا اعزاز اور کیا ہو گا کہ استادِ محترم مجھے اپنا چوتھا بیٹا کہتے تھے۔

اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

سوال: شاعری کا آغاز ۱۹۸۰ میں ہوا۔ پہلا شعر آج بھی یاد ہے؟

جواب: پہلا شعر بھلایا نہیں جا سکتا۔ فنی اعتبار سے شاید خام تھا مگر اس میں دل کی

ہے مگر شاعر بنتا مسلسل ریاضت سے ہے۔ صرف جذبات کافی نہیں ہوتے، مطالعہ، مشق اور وقت بھی ضروری ہیں۔

سوال: زندگی نے آپ کو سب سے بڑی تعلیم کیا دی؟

جواب: خاموشی۔ جو خاموشی کو سمجھ لیتا ہے، وہ لفظوں کو بھی سمجھنے لگتا ہے۔

لفظوں کے موسم، مشاعرے اور

آنے والا وقت کامل جنیٹوی صاحب کے نام کو کس درجے پر رکھے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہو گا لیکن ان سے گفتگو کے بعد اتنا یقین ضرور ہوا کہ زبانیں صرف کتابوں سے اپنا وجود برقرار نہیں رکھتیں، ان لوگوں سے بھی زندہ رہتی ہیں جو اپنی پوری زندگی کو ایک خاموش چراغ بنا دیتے ہیں۔

علم کا سفر کسی سند پر ختم نہیں ہوتا۔

میں نے انٹر میڈیٹ تک اردو کے ساتھ تعلیم حاصل کی، جامعہ اردو علیگڑھ کے امتحانات پاس کیے۔

سوال: استاد زوّار حسن شیدا سنبھلی کی شاگردی نے آپ کو سب سے بڑا سبق کیا دیا؟

جواب: انہوں نے مجھے صرف عروض نہیں سکھائے بلکہ انسان بننا سکھایا۔ کہتے تھے کہ اچھا شعر کہنے سے پہلے اچھا انسان بنو۔ لفظوں کی عزت کرنا سیکھو

سچائی شامل تھی۔ وہی سچائی آج تک میرے ساتھ چل رہی ہے۔

پہلی نعت پاک اور غزل کا شعر آج بھی یاد ہے۔

روضۂ فخرِ دو عالم کس قدر پُر نور ہے
ذرّہ ذرّہ ان کے کوچے کا چراغِ طور ہے

دل ہی قبضے میں جب نہ ہو اپنے
دھڑکنوں کا شمار کون کرے

سوال: کیا شاعر پیدا ہوتا ہے یا بنتا ہے؟

جواب: شاعر شاید احساس لے کر پیدا ہوتا

سرحدوں سے آزاد ادب وقت کی رفتار اب گفتگو کو ایک اور موڑ پر لے آئی تھی۔ اسکرین کے اُس پار بیٹھے شاعر کبھی مسکرا دیتے، کبھی کسی سوال پر چند لمحے خاموش رہتے، جیسے جواب لفظوں میں نہیں، یادوں میں تلاش کر رہے ہوں۔

سوال: آپ نے حمد، نعت، منقبت، غزل، نظم، رباعی، قطعہ، دوہا، ماہیہ، ہائیکو، رینگا اور تنکا تک میں طبع آزمائی کی۔ اتنی مختلف اصناف میں سفر کیسے ممکن

ہوا؟

جواب: میرے نزدیک ہر صنف احساس کا الگ لباس ہے۔ خیال وہی رہتا ہے، اظہار بدل جاتا ہے۔ کبھی غزل مناسب لگتی ہے، کبھی نظم، کبھی تین مصرعوں میں پوری کیفیت سمٹ آتی ہے۔

یہاں میں دو شخصیات کا ذکر نہ کروں تو یہ سراسر احسان فراموشی ہوگی۔

اول میرے محترم دوست ڈاکٹر طاہر رزّاقی (مرحوم) جن کی قربتوں نے مجھے "رباعی" اور "تاریخی قطعات" کی طرف راغب کیا۔ اللہ تعالیٰ ان کی مغفرت فرمائے، آمین۔

دوسری شخصیت محترم ڈاکٹر فراز حامدی صاحب (جے پور راجستھان) ہیں جنھوں نے مجھے جدید اصناف کی تحریک بخشی۔ اللہ تعالیٰ انہیں عمرِ دراز عطا فرمائے، آمین۔

سوال: آپ کے نزدیک شاعری کی اصل تعریف کیا ہے؟

جواب: شاعری میرے لیے لفظوں کی آرائش نہیں، احساس کی عبادت ہے۔ جب دل کسی سچائی کو خاموش نہیں رہنے دیتا تو شعر جنم لیتا ہے۔

سوال: آل انڈیا ریڈیو سے آپ کا تعلق چار دہائیوں سے زیادہ عرصے پر محیط ہے۔ یہ سفر کیسا رہا؟

جواب: ۱۹۸۱ سے آل انڈیا ریڈیو رامپور سے وابستگی ہے۔ مختلف دوردرشن مراکز سے بھی کلام نشر ہوا۔ ہر نشریہ میرے لیے خوشی سے زیادہ ذمہ داری کا احساس لے کر آیا اور مسلسل چلتے رہنے کی تحریک بخشی۔

سوال: مشاعروں کی روایت میں سب سے بڑی تبدیلی کیا محسوس کرتے ہیں؟

جواب: پہلے مشاعرے تربیت گاہ ہوتے تھے، اب تفریح کا رنگ کچھ زیادہ نمایاں ہے۔ تاہم اچھے شعرا آج بھی موجود ہیں اور اچھی روایت بھی باقی ہے۔

سوال: آن لائن عالمی مشاعروں نے ادب کو کیا دیا؟

جواب: فاصلے ختم کر دیے۔ آج ایک شاعر اپنے گھر سے پوری دنیا کے سامعین تک پہنچ سکتا ہے بشرطیکہ معیار کو قربان نہ کیا جائے۔

سوال: آپ کے کلام کی اشاعت ہندوستان اور پاکستان ہر دو ممالک کے ادبی رسائل میں ہوتی رہی ہے۔ کیا ادب واقعی سرحدوں سے آزاد ہے؟

جواب: ادب کا وطن انسان کا دل ہے۔ زبانیں نفرت بانٹنے کے لیے نہیں، محبت جوڑنے کے لیے پیدا ہوئی ہیں۔ اگر ایک شعر سرحد پار کسی دل کو چھو لے تو یہی اس کی اصل کامیابی ہے۔

سوال: آپ اردو سے ناواقف دیہات میں تنہا اردو کی شمع روشن کیے ہوئے ہیں۔ کبھی تھکن محسوس نہیں ہوتی؟

جواب: محبت میں تھکن نہیں ہوتی۔ اگر ایک بچہ بھی اردو سیکھ لے تو میں سمجھتا ہوں کہ میری محنت وصول ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ کا خاص کرم یہ بھی ہے میرے اہلِ خانہ اردو والے ہیں۔ خاص بات یہ کہ میرا بیٹا وقار جنیٹوی (ایم۔اے۔ اردو/انگریزی) اچھے اشعار کہتا ہے اور وہ بھی ریڈیو اور دوردرشن سے نشر ہو رہا ہے۔

سوال: کیا کبھی ایسا لگا کہ آپ کی خدمات کا اعتراف کم ہوا؟

جواب: اعتراف مل جائے تو شکر، نہ ملے تو صبر۔ میرا اصل انعام یہ ہے کہ میں بساط بھر اردو کی خدمت کر رہا ہوں۔ آپ سرحد پار سے مجھ سے مخاطب ہیں، بھلا اس سے بڑا اعتراف کیا ہوگا:

چراغ کی لو اور آنے والے کل کی امید

گفتگو اب اپنے آخری مرحلے میں داخل ہو چکی تھی مگر محسوس یہی ہو رہا تھا کہ جیسے ابھی کئی دریچے کھلنے باقی ہیں۔ اسکرین پر موجود چہرہ ایک شاعر کا تھا مگر اس کے پیچھے ایک معلم، ایک مبصر، ایک درویش، ایک کارکن اور ایک خاموش سپاہی بھی دکھائی دیتا تھا۔

سوال: شاعر کی سب سے بڑی ذمہ داری کیا ہے؟

جواب: شاعر کو دلوں میں روشنی پیدا کرنی چاہیے۔ نفرت کے بجائے محبت، نفاق کے بجائے اتفاق اور مایوسی کے بجائے امید لکھنی چاہیے۔

سوال: نئی نسل کے شعرا کے لیے آپ کا سب سے اہم مشورہ؟

جواب: مطالعہ کریں، کلاسیکی ادب سے رشتہ جوڑیں، سستی شہرت کے پیچھے نہ بھاگیں۔ اچھی شاعری وقت، صبر اور مسلسل ریاضت مانگتی ہے۔

بہتر ہے خود تلاش کرو اپنی منزلیں
عزمِ سفر جواں ہے تو ہیں راستے بہت
تمہیں شہرت تو مل سکتی ہے وقتی طور پر لیکن
کسی کی چاپلوسی دائمی عزّت نہ بخشے گی
کرو نوکِ قلم کی زد پہ خود پیدا مقام اپنا
تمہاری جانفشانی ہی تمہارے کام آئے گی

سوال: اگر زندگی دوبارہ ملے تو کیا پھر یہی راستہ اختیار کریں گے؟

جواب: جی ہاں۔ یقیناً پھر بھی اردو ہی میرا انتخاب ہوگی۔

سوال: آپ کے نزدیک کامیابی کیا ہے؟

جواب: جب انسان اپنے ضمیر کے سامنے سرخرو ہو جائے، وہی کامیابی ہے۔

سوال: کیا آپ کو مستقبل میں اردو کے لیے اُمید نظر آتی ہے؟

جواب: امید ہمیشہ رہتی ہے۔ جب تک ایک بھی شخص محبت سے اردو بولتا رہے گا، یہ زبان زندہ رہے گی۔

سوال: اگر آپ اپنی پوری زندگی کو ایک مصرعے میں سمیٹیں؟

جواب: ”میں اک چراغ ہوں جلنا ہی میری قسمت ہے۔“

سوال: آخر میں قارئین کے لیے کوئی پیغام؟

جواب: کتابوں سے دوستی کریں، زبانوں کا احترام کریں اور انسانوں کے درمیان محبت کے پل تعمیر کریں۔ یہی ادب کا اصل مقصد ہے۔

اسکرین خاموش ہو چکی تھی۔
رابطہ منقطع ہو گیا تھا۔
مگر گفتگو ختم نہیں ہوئی تھی

کیونکہ کچھ آوازیں رابطے ختم ہونے کے بعد بھی دل میں گونجتی رہتی ہیں۔ کامل جنیٹوی صاحب سے یہ گفتگو بھی ایسی ہی تھی۔ یوں محسوس ہوا جیسے کسی دور افتادہ گاؤں کی شام میں ایک پرانا چراغ اب بھی جل رہا ہو اور اس کی مدھم سی لو آنے والی نسلوں کو راستہ دکھانے کے لیے کافی ہو۔

ادب کی دنیا ہمیشہ بڑے ناموں سے نہیں چلتی بلکہ ان گمنام ہاتھوں سے ہی آباد رہتی ہے جو خاموشی سے لفظوں کی کھیتی تیار کرتے ہیں۔ کامل جنیٹوی انہی کسانوں میں سے ایک ہیں جنھوں نے نہ شہرت کی فصل اُگائی، نہ صلے کی تمنا کی، بس اُردو کی خوشبو میں رچی مٹی کو اپنے خوب صورت احساسات سے سینچتے رہے۔

آنے والا وقت ان کے نام کو کس درجے پر رکھے، یہ تاریخ کا فیصلہ ہوگا لیکن آج کی اس گفتگو کے بعد اتنا یقین ضرور ہوا کہ زبانیں صرف کتابوں سے اپنا وجود برقرار نہیں رکھتیں، ان لوگوں سے بھی زندہ رہتی ہیں جو اپنی پوری زندگی کو ایک خاموش چراغ بنا دیتے ہیں۔

اور کامل جنیٹوی صاحب انہی چراغوں میں سے ایک روشن چراغ ہیں۔

ہجرت کے بعد

اُردو سے میرا رِشتہ:

امریکا میں اردو ادب کی نئی جہات

سلیم خان

(ہیوسٹن (ٹیکساس) امریکا)

ہجرت صرف گھر، شہر یا ملک بدلنے کا نام نہیں۔ میرے نزدیک ہجرت انسان کے اندر بھی ایک سفر شروع کرتی ہے۔ آدمی جب اپنی مٹی سے دور ہوتا ہے تو اسے اپنی زبان، اپنی تہذیب، اپنی یادوں اور اپنے فکری ورثے کی قدر پہلے سے کہیں زیادہ محسوس ہونے لگتی ہے۔ کچھ رشتے فاصلوں سے کمزور پڑ جاتے ہیں مگر زبان کا رشتہ ایسا ہے جو دوری کے ساتھ بعض اوقات اور بھی گہرا ہو جاتا ہے۔ امریکا آمد کے بعد اردو کے ساتھ میرا تعلق بھی اسی نوعیت کے ایک نئے تجربے سے گزرا ہے۔

میں اوائل فروری 2024ء میں پاکستان سے امریکا منتقل ہو کر (ہیوسٹن) ٹیکساس میں مقیم ہوا۔ پاکستان میں رہتے ہوئے اردو میرے لئے زندگی کا ایک فطری حصہ تھی لیکن امریکا آ کر پہلی مرتبہ شدت سے احساس ہوا کہ زبان صرف بولنے کا وسیلہ نہیں بلکہ شناخت کو محفوظ رکھنے کا ایک اہم ذریعہ بھی ہے۔ خصوصاً تارکینِ وطن کے لیے مادری زبان ماضی اور حال کے درمیان ایک ایسا پل ہوتی ہے جس کے ذریعے وہ اپنی تہذیبی جڑوں سے وابستہ رہتے ہیں۔

ہیوسٹن میں قیام کے دوران مجھے امریکا کے کثیر الثقافتی معاشرے کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ یہاں دنیا کے مختلف خطوں سے آئے ہوئے لوگ اپنی زبانوں، ثقافتوں اور روایات کے ساتھ زندگی گزار رہے ہیں۔ اس ماحول میں اردو کے لیے امکانات بھی بے شمار ہیں اور چیلنجز بھی۔ سب سے بڑا چیلنج شاید یہ ہے کہ ہماری نئی نسل اردو سے کس حد تک جڑی رہے گی؟

یہ سوال میرے لیے محض ایک ادبی یا لسانی سوال نہیں بلکہ ایک ذاتی اور تہذیبی سوال بھی ہے۔ میرے خیال میں یہ حقیقت تسلیم کرنا ضروری ہے کہ امریکا میں پلنے والی اردو داں نسل کا ماحول پاکستان سے بالکل مختلف ہے۔ اس کی تعلیم، پیشہ ورانہ زندگی، سماجی روابط اور روزمرہ کا بڑا حصہ انگریزی زبان میں ہوتا ہے۔ اگر اردو صرف گھر کے بزرگوں سے بات چیت یا سال میں چند ثقافتی تقریبات تک محدود ہو جائے تو نئی نسل کے لیے اس کا دائرۂ استعمال بتدریج سکڑ سکتا ہے۔ اس صورتِ حال میں صرف اردو سے محبت کا اظہار کافی نہیں، ہمیں اردو کو نئی نسل کی علمی، فکری اور تخلیقی زندگی سے بھی جوڑنا ہوگا۔

میرے نزدیک یہی وہ مقام ہے جہاں ادب اپنا حقیقی کردار ادا کرتا ہے۔

ادب کسی زبان کو محض محفوظ نہیں کرتا، اسے زندہ رکھتا ہے۔ شاعری، افسانہ، تحقیق، تنقید، مکالمہ، تعلیم اور صحافت۔۔۔ یہ سب زبان کے زندہ رہنے کے راستے ہیں۔ اگر ہم اردو کو صرف ماضی کی عظیم شاعری اور ادبی روایت تک محدود کر دیں گے تو نئی نسل کے لیے یہ ایک خوب صورت مگر دور کی چیز بن جائے گی۔ ہمیں اسے موجودہ عہد کے سوالات، جدید تعلیم، ٹیکنالوجی اور عالمی مسائل سے جوڑنا ہوگا۔

اسی احساس نے امریکا آنے کے بعد میری ادبی سرگرمیوں کو ایک نئی سمت دی۔

میں نے مختلف ادبی اور فکری پلیٹ فارمز کے ساتھ اپنی وابستگی کو محض ادبی مصروفیت نہیں سمجھا بلکہ اسے اردو کے وسیع تر فروغ کی ایک کوشش کے طور پر دیکھا۔ عالمی بزمِ اردو، بزمِ اردو انٹرنیشنل کینیڈا، اندازِ بیاں اور (برطانیہ)، دریچۂ ادب پاکستان، ماورا ورلڈ لٹریری فورم امریکا، حصارِ ادب عالمی، تحریکِ توازن اردو ادب، ہم زبان (بزمِ علم وادب) جدہ سعودی عرب، تخلیق کار انٹرنیشنل اور دیگر ادبی و فکری فورمز سے وابستگی کے دوران مجھے یہ تجربہ

ہوا کہ اردو دنیا کے مختلف ملکوں میں بکھرے ہوئے لوگوں کو ایک مشترکہ فکری رشتے میں جوڑنے کی بھرپور صلاحیت رکھتی ہے۔

عالمی اردو معاشرہ

آج اردو صرف پاکستان یا ہندوستان تک محدود زبان نہیں رہی۔ دنیا کے مختلف ممالک میں اردو بولنے، پڑھنے اور لکھنے والے موجود ہیں۔ اس عالمی اردو معاشرے کی اپنی ایک الگ شناخت ابھر رہی ہے۔کینیڈا، امریکا، برطانیہ، خلیجی ممالک اور دنیا کے دوسرے خطوں میں اردو کے ادبی حلقے سرگرم ہیں۔ ان حلقوں کو اگر جدید ٹیکنالوجی کے ذریعے ایک دوسرے سے مربوط کیا جائے تو اردو ادب ایک مضبوط عالمی ادبی نیٹ ورک کی شکل اختیار کر سکتا ہے۔

میں سمجھتا ہوں کہ ڈیجیٹل عہد نے اردو کو یہ تاریخی موقع فراہم کیا ہے۔

چند دہائیاں پہلے اگر امریکا میں رہنے والا کوئی شخص پاکستان یا ہندوستان کے کسی شاعر، ادیب یا محقق سے براہِ راست ادبی رابطہ کرنا چاہتا تو اس کے لیے خاصی محنت درکار ہوتی تھی۔ آج ایک آن لائن نشست، ویڈیو کانفرنس، ڈیجیٹل رسالہ یا سوشل میڈیا پلیٹ فارم چند لمحوں میں دنیا کے مختلف حصوں کے اہلِ قلم کو ایک جگہ جمع کر سکتا ہے۔ جغرافیائی فاصلے کم ہوئے ہیں اور ادبی رابطوں کے امکانات کئی گنا بڑھ گئے ہیں۔

لیکن ڈیجیٹل دنیا اپنے ساتھ ایک چیلنج بھی لائی ہے: مواد کی فراوانی کے باوجود معیار کی کمی۔

آج ہر شخص لکھ سکتا ہے، ہر تحریر فوراً شائع ہو سکتی ہے اور ہر رائے چند لمحوں میں ہزاروں لوگوں تک پہنچ سکتی ہے۔ ایسے ماحول میں مستند، معیاری اور فکری طور پر مضبوط اردو مواد کی ضرورت پہلے سے کہیں زیادہ بڑھ گئی ہے۔ میرے خیال میں مستقبل کی اردو ادبی تنظیموں کو صرف پروگرام منعقد کرنے تک محدود نہیں رہنا چاہیے بلکہ انہیں معیاری مطالعے، تحقیق، تنقیدی مکالمے اور علمی مواد کی تیاری پر بھی توجہ دینا ہوگی۔

یہی وجہ ہے کہ میں نے ادب اور تعلیم کے باہمی تعلق کو ہمیشہ اہم سمجھا ہے۔

"تفہیمِ فکرِ اقبال"، "اساسِ تحقیق"، "تعلیم سب کے لیے" اور "امتحانات کی تیاری" جیسے پلیٹ فارمز کے ذریعے میری کوشش یہی رہی ہے کہ اردو کو صرف ادبی ذوق کی زبان نہ سمجھا جائے بلکہ اسے علم، تحقیق اور فکری تربیت کے وسیلے کے طور پر بھی استعمال کیا جائے۔ میری نظر میں اگر اردو میں تحقیق کا ذوق پیدا نہیں ہوگا، اگر نئی نسل اس زبان میں سوال کرنا نہیں سیکھے گی اور اگر اسے جدید علمی موضوعات پر اظہار کا موقع نہیں ملے گا تو ہماری زبان کی بقا کا خواب ادھورا رہے گا۔

میں نے اپنی پیشہ ورانہ زندگی میں ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل اداروں (مارکیٹنگ) اور موبائل ٹیلی کام سیکٹر میں بطور پراجیکٹ اور کنٹریکٹ مینیجر کام کیا ہے۔ اس تجربے نے مجھے منصوبہ بندی، نظم و ضبط، ٹیم ورک، رابطہ کاری اور تسلسل کی اہمیت سکھائی۔ ادب کی دنیا میں آنے کے بعد مجھے احساس ہوا کہ یہ صلاحیتیں ادبی سرگرمیوں کو منظم اور مؤثر بنانے میں بھی کام آ سکتی ہیں۔

میرے لیے ادبی تنظیم کاری کا مطلب صرف ایک پروگرام منعقد کر دینا نہیں۔ اس کے پیچھے ایک پورا عمل ہوتا ہے: موضوع کا انتخاب، اہلِ علم سے رابطہ، پروگرام کی منصوبہ بندی، مختلف ممالک میں موجود افراد کو جوڑنا، نئی آوازوں کو موقع دینا، مواد کو محفوظ کرنا اور پھر اس علمی سرمایہ کو زیادہ سے زیادہ قارئین تک پہنچانا۔

میں سمجھتا ہوں کہ اردو ادب کو آج ایسے ہی منظم اور مربوط ادبی اداروں کی ضرورت ہے۔

میرے لیے اردو کی خدمت کسی اعزاز، عہدے یا شناخت کی طلب نہیں بلکہ ایک ایسی ذمہ داری ہے جس کا احساس وقت کے ساتھ مزید گہرا ہوتا جا رہا ہے۔ ہجرت نے مجھے یہ سکھایا کہ اپنی زبان سے حقیقی وفاداری صرف اسے یاد کرنے میں نہیں بلکہ اسے نئی نسل کے لیے قابلِ فہم، قابلِ استعمال اور قابلِ احترام بنانے میں ہے۔ امریکا میں رہتے ہوئے میری کوشش ہے کہ اردو کو ماضی کی یادگار کے طور پر نہیں بلکہ مستقبل کی زبان کے طور پر دیکھا جائے۔ ایسی زبان جو جدید تعلیم، تحقیق، ڈیجیٹل دنیا، تخلیقی اظہار اور عالمی مکالمے میں اپنا مؤثر کردار ادا کر سکے۔ اگر ہماری اجتماعی کوششوں سے ایک نوجوان اردو کی طرف متوجہ ہوتا ہے، ایک قاری کتاب سے رشتہ جوڑتا ہے، ایک قلم کار کو اظہار کا موقع ملتا ہے یا دنیا کے کسی دوسرے خطے میں موجود اہلِ اردو سے فکری رابطہ قائم ہوتا ہے تو میں اسے اپنی ادبی جدوجہد کی سب سے بڑی کامیابی سمجھوں گا۔ میری خواہش ہے کہ آنے والی نسلیں اردو کو صرف اپنے بزرگوں کی زبان کہہ کر نہ پکاریں بلکہ اسے اپنی سوچ، اپنی تخلیق اور اپنی شناخت کی زندہ زبان سمجھیں۔ یہی میری ہجرت کے بعد اردو سے وابستگی کا حاصل بھی ہے اور میری آئندہ ادبی کاوشوں کا بنیادی مقصد بھی۔

مولانا محمد عبدالملک جامعی مدنی

صاحبِ طرز ادیب اور مبلغ

معصوم مرادآبادی
(نئی دہلی۔ ہندوستان)

صاحبِ طرز ادیب اور مبلغ مولانا محمد عبدالملک جامعی مدنی 12/اکتوبر 1912 میں مغربی اتر پردیش کے شہر مرادآباد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد منشی عبدالقیوم خاں ملک کے مشہور خطاط تھے اور انھوں نے مولانا ابوالکلام آزاد کے ساتھ کلکتہ میں رہ کر"ترجمان القرآن" جلد دوم کی کتابت کا فریضہ انجام دیا۔ محمد عبدالملک جامعی کی ابتدائی تعلیم وتربیت بجنور میں ہوئی، جہاں ان کے والد منشی عبدالقیوم خاں اخبار"مدینہ" سے وابستہ تھے۔ اس کے بعد وہ دہلی آگئے اور 1929 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں داخلہ لیا۔ جامعہ اس وقت اپنے ابتدائی دور میں تھا اور قرول باغ میں اس کی عمارت تھی۔ جامعہ میں تعلیم کے دوران ایک طرف جہاں بانئ جامعہ مولانا محمد علی جوہر کے قریب رہے تو وہیں شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خاص توجہ حاصل رہی اور ان کے چہیتے شاگرد رہے۔ وہ جامعہ کے ابتدائی دور کے گریجویٹ تھے۔ گریجویشن کے بعد کچھ عرصہ جامعہ میں ملازمت بھی کی اور یہاں کئی شعبوں کی بنیاد ڈالی۔ آزادی سے قبل 1946 میں مدینہ منورہ ہجرت کی اور وہاں یوسف سیٹھی کے ساتھ مل کر تحفیظ القرآن کے ہزاروں مدارس قائم کئے۔ وہیں 13/اپریل 1991 میں وفات پائی اور جنت البقیع میں مدفون ہیں۔

مولانا محمد علی جوہر سے محمد عبدالملک جامعی کا تعلق جامعہ ملیہ اسلامیہ میں دوران تعلیم ہوا تھا اور یہ تعلق اتنا گہرا اور والہانہ تھا کہ انھوں نے تمام زندگی محمد علی جوہر کی شخصیت اور ان کے کارناموں کے بارے میں سوچتے، بولتے اور لکھتے ہوئے گذاری۔

مولانا محمد عبدالملک جامعی کی ابتدائی تعلیم مرادآباد میں ہوئی لیکن ان کی اصل تربیت بجنور میں ہوئی، جہاں وہ اپنے والد محترم منشی عبدالقیوم خاں کے ساتھ محض دس برس کی عمر میں 1922 میں تشریف لے گئے تھے۔ بجنور میں آپ نے مختلف اساتذہ سے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ اسی دوران ایک مشہور استاد سے خوشنویسی کی اصلاح بھی لی اور اپنے والد کی طرح اس میں مہارت بھی حاصل کی لیکن اس کو ذریعہ معاش نہیں بنایا بلکہ خوشنویسی کا فن شوقیہ طور پر سیکھا۔ پہلی مرتبہ آپ بجنور کے ہی پبلک انگلش اسکول میں داخل ہوئے اور یہاں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ بجنور کے قیام کے وقت حالانکہ مولانا محمد عبدالملک جامعی کی عمر بہت کم تھی لیکن چونکہ انھیں علمی ذوق اپنے ذی علم والد سے ورثے میں ملا تھا لہٰذا اتنی کم عمری میں وہ اس راستے پر چل نکلے جس کے لئے شعور کی منزل کو پہنچنا لازمی ہوتا ہے۔ بجنور

میں آپ کو جو انتہائی سازگار ماحول ملا، اس نے ان کی ذہنی تربیت میں نمایاں کردار ادا کیا۔ ”مدینہ“ اخبار کا پورا ادارہ آپ کے لئے ایک ایسے مدرسے اور مکتب کی صورت میں تھا جہاں علمی، ادبی شخصیات کی پوری کہکشاں موجود تھی۔ اخبار”مدینہ“ کے مدیران میں قاضی عدیل عباسی، مولانا امین احسن اصلاحی، ملک نصراللہ خاں عزیز، پروفیسر شبیرالحسن ایم اے، قاضی بدر جلالی، حافظ علی بہادر خاں، محمد احسن بچھرایونی (مسعودالحسن بیرسٹر کے حقیقی بھتیجے)، مولوی نورالرحمن بی اے اور حمید حسن خاں جیسے ذی علم اور وسیع المطالعہ لوگ سب بالواسطہ یا بلاواسطہ آپ کے اساتذہ تھے۔ مولانا امین احسن اصلاحی سے اردو ادب کے علاوہ عربی اور فارسی کی تعلیم حاصل کی اور انھوں نے ہی مضمون نگاری بھی سکھائی جبکہ ملک نصراللہ خاں عزیز سے انگریزی کی ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ قاضی عدیل عباسی نے جلسوں اور مجامع میں بولنا سکھایا۔ قاضی بدر جلالی نے آپ کے دل میں مولانا محمد علی کی والہانہ محبت پیدا کی اور ایسی کہ تمام عمر محمد علی جوہر کے بارے میں سوچتے، بولتے اور لکھتے رہے۔ اس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ مولانا عبدالملک جامعی کے پاس درسی کتابوں سے زیادہ مجلسی علم تھا، جو ساری عمران کے کام آتا رہا۔ اخبار”مدینہ“ کے لائق وفائق مدیران گرامی نے ان کی ایسی ذہنی اور شعوری تربیت کی جو ان کی شخصیت کی تعمیر میں بہت کارآمد ثابت ہوئی۔ مولانا محمد علی جوہر کی جو محبت قاضی بدر جلالی نے پیدا کی تھی، اس کے نتیجے میں بے شمار مضامین اور مقالے اردو اور انگریزی زبان میں قلم بند کئے۔ ان مقالوں کی تعداد اتنی ہے کہ انھیں کئی کتابوں کی شکل میں شائع کیا جاسکتا تھا، لیکن افسوس ان میں سے بیشتر دست بردزمانہ کی نذر ہوگئے۔ مولانا محمد علی جوہر سے بے پایاں محبت کا ہی نتیجہ تھا کہ انھیں جامعہ میں ان سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔

مولانا محمد عبدالملک جامعی تقریباً سولہ برس جامعہ ملیہ اسلامیہ میں رہے۔ پہلے طالب علم کے طور پر اور پھر کچھ عرصے مدرس کے طور پر۔ جامعہ میں طالب علمی کے زمانے میں بزم ادب کے صدر تھے اور تحریری وتقریری مقابلوں میں ہمیشہ اول آتے تھے۔ شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین کی خصوصی توجہ حاصل تھی اور وہ ہمیشہ ان کی حوصلہ افزائی کیا کرتے تھے۔ اردو کلاسوں میں ذاکر صاحب کی شاگردی کا شرف بھی حاصل رہا۔ ذاکر صاحب کی سرپرستی میں 1933 اور 1934 میں مدراس اور حیدرآباد میں منعقدہ آل انڈیا تحریری مقابلوں میں شرکت کی اور دونوں مقابلوں میں پہلی پوزیشن حاصل کی اور گولڈ میڈل حاصل کیا۔ جامعہ میں دوران تعلیم ابتدائی کلاسوں میں ’بزم ادب‘ کے صدر بھی بنائے گئے۔

مولانا عبدالملک جامعی کو بچپن ہی میں تحریر پر مہارت حاصل ہوگئی۔ اپنی خداداد صلاحیتوں کی وجہ سے ہی بعد کو طلبا کی میگزین ”ہلچل“ کے مدیر بھی بنائے گئے۔ جامعہ میں دوران تعلیم جن لائق و فائق اساتذہ سے تعلیم حاصل کی، ان میں سعد انصاری ندوی، گاندھی جی کے صاحبزادے دیوداس گاندھی، مولوی ارشادالحق، عبدالجلیل ندوی، شفیق الرحمن قدوائی، ڈاکٹر ذاکر حسین، سید عابد حسین اور پروفیسر محمد مجیب کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان کے علاوہ جن اساتذہ اور اکابرین سے مختلف اوقات میں کسب فیض کیا ان میں مولانا عبدالماجد دریابادی سے دس دن دریاباد میں رہ کر استفادہ کیا۔ رئیس جعفری، مولانا محمد علی اور شوکت علی اور خواجہ حسن نظامی سے بھی استفادہ کیا۔ خواجہ حسن نظامی کے بڑے صاحبزادے جامعہ میں آپ کے ہم جماعت تھے۔

1942 میں جامعہ ملیہ اسلامیہ سے گریجویشن کیا۔ اپنی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے طالب علمی کے زمانے میں ادارہ تعلیم وترقی کے نائب مدیر بنائے گئے۔ یہ سماجی تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ تھا، جہاں انھوں نے دوران تعلیم ہی 1939 میں ملازمت کا آغاز کیا اور یہ سلسلہ

1946 تک جاری رہا۔ شعبۂ تعلیم و ترقی سے وابستگی کے دوران انھوں نے اس ادارے میں جو خدمات انجام دیں، ان میں بہت سی کتابوں کی تالیف کا کام بھی شامل ہے۔ اس دوران دوسری زبانوں سے ترجمے بھی کیئے۔ جامعہ ملیہ اسلامیہ میں تعلیم بالغاں کا شعبہ قائم ہوا تو آپ اس کے نگراں بنائے گئے۔ یہ ذمہ داری شیخ الجامعہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے آپ کے سپرد کی تھی۔

مولانا محمد عبدالملک جامعی کے بارے میں جامعہ ملیہ کالج کے پرنسپل نے جو توصیف نامہ جاری کیا تھا، اس کا متن ملاحظہ فرمائیں۔

"میں اس بات کی تصدیق کرنے میں بہت خوشی محسوس کرتا ہوں کہ مولوی محمد عبدالملک صاحب، جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی کے ساتھ تقریباً 16 سال تک متعلق رہے، بحیثیت طالب علم اور بحیثیت ممبر آف دی اسٹاف۔ انھوں نے 1942 میں بی اے پاس کیا، لیکن اپنی غیر معمولی صلاحیت کی وجہ سے کالج کی طالب علمی کے زمانے میں ادارہ تعلیم و ترقی کے نائب مدیر کی جگہ ان کو دی گئی۔ یہ سماجی تعلیم کا ایک مرکزی ادارہ تھا۔ 1939 میں یہ ملازمت شروع ہوئی، 1946 تک جاری رہی۔ اس دوران میں انھوں نے ادارہ کی جو خدمات کیں، ان میں بہت سی تالیفات بھی ہیں، بعض ترجمے ہیں جو دوسری زبان سے کیئے اور بعض ان کی اہم تصانیف ہیں۔"

مولانا محمد عبدالملک جامعی کی تصنیفات

مولانا محمد عبدالملک جامعی کو تصنیف و تالیف سے بہت لگاؤ تھا۔ طالب علمی کے زمانے میں ہی انھوں نے مضامین اور کتابچے لکھنے شروع کر دیئے تھے۔ ایک وسیع المطالعہ شخص کے طور پر لکھنے لکھانے کی طرف رجحان فطری عمل تھا۔ یہی وجہ ہے آپ نے جامعہ ملیہ سے وابستگی کے دوران اور پھر اس کے بعد حجاز کے قیام کے دوران ہزاروں مضامین اور درجنوں تصنیفات قلم بند کیں۔ بدقسمتی سے ان میں سے بیشتر شائع نہیں ہوسکیں اور کئی اہم تصنیفات ضائع ہوگئیں۔ ہم ذیل میں مولانا عبدالملک جامعی کی کچھ اہم تصنیفات کا سرسری جائزہ لیں گے تاکہ آپ کو ان کے علمی اور تحقیقی رجحانات کا اندازہ ہوسکے۔ ان کے بیشتر مضامین "تعمیر حیات" (لکھنؤ)، "چٹان" (لاہور)، "معارف" (اعظم گڑھ)، "جامعہ" (دہلی)، روزنامہ "الجمعیۃ" اور روزنامہ "قومی آواز" (دہلی) میں شائع ہوئے۔

حجاز و ماورائے حجاز

مطبوعہ تصنیفات میں سب سے اہم کتاب "حجاز و ماورائے حجاز" (دو حصے) ہے جس کا پہلا حصہ انھوں نے خود محمد علی اکادمی (مدینہ منورہ) سے 1399 ہجری میں شائع کیا تھا جبکہ دوسرا حصہ 1406 ہجری میں ندوۃ المصنفین، دہلی کے اہتمام شائع ہوا تھا۔ پہلا حصہ جزیرہ العرب کا ایک تفصیلی سفرنامہ ہے جبکہ دوسرے حصے میں حجاز کی کہانی، حجاج کی زبانی بیان کی گئی ہے۔ پہلے حصے کے مقدمے میں لکھا ہے کہ "اس خاکسار نے اب سے تیس برس پہلے جب 'ہزار سالہ حج' کے رسالوں کی تحریر کا سلسلہ شروع کیا تھا تو اس وقت تعلیم بالغاں کے تصور کے تحت حج کی کہانیوں کے ذریعہ حجاج کو تاریخ، جغرافیہ اور ثقافت کی تعلیم دی جائے، اس لئے انداز کو سادہ اور زبان کو آسان رکھنے کی کوشش کی گئی۔ یہ اس سلسلے کی آخری نہ سہی مگر تازہ ترین تحریر ہے اور اس میں بھی وہی بنیادی رنگ ہے۔"

اس کتاب میں انتہائی آسان اور دل نشین پیرائے میں جزیرہ عرب کی سیر کرائی گئی ہے۔

دوسرے حصے میں یہ نوید سنائی گئی ہے کہ "یہ حصہ اور آنے والے حصے میری چالیس سالہ کاوش اور ایک ہزار سے زائد کتابوں، مجلّات و جرائد کے مطالعہ کا نتیجہ ہیں، بظاہر 'کوہ کندن و کاہ برآوردن' کا مصداق ہیں، لیکن میں سمجھتا ہوں کہ وہ جو کسی کی سعی کو ضائع نہیں کیا کرتا، شاید اس تنکے کو کسی ڈوبتے کا سہارا بنا دے۔"

اس اہم کتابی سلسلہ کی تیاری میں مولانا عبدالملک جامعی نے جس کتب خانے سے سب

سے زیادہ استفادہ کیا، اس کا تذکرہ کرتے ہوئے موصوف نے شیخ عبدالوہاب دہلوی ثم مکیؒ (خاندان علی جان) کے تئیں ممنونیت کا اظہار کیا ہے جن کے کتب خانے کی نادر و نایاب کتابوں سے انھوں نے بے دریغ فائدہ اٹھایا۔ یہ وہی کتب خانہ مرحوم ہے، جس کے مرہون منت اور ہمیشہ شکر گذار رہنے والوں میں شہرہ آفاق مولانا عبیداللہ سندھی اور اسلامی روس کا بحر العلوم اور مجاہد اکبر موسیٰ جاء قازانی بھی شامل ہیں۔"

افسوس اس بات کا ہے کہ اس اہم ترین کتاب کے دو حصے ہی منظر عام پر آسکے اور باقی حصوں کا کچھ پتہ نہیں چلا۔ یہ دونوں حصے بھی اب نایاب ہیں، البتہ دونوں کی ایک ایک جلد راقم الحروف کے ذاتی کتب خانے مولانا محمد عبدالملک جامعی کی دیگر چیزوں کے ساتھ محفوظ ہے۔

اسلام کے چار عناصر

ان چیزوں میں دوسری اہم کتاب "اسلام کے چار عناصر" ہے۔ اس کتاب میں عز و شرف، راحت و آسائش، فرحت و شادمانی اور حسن و جمال کی قرآن مجید اور احادیث شریفہ کا ایک نیا مطالعہ یا ان کی نئی توجیہات پیش کی گئی ہیں۔ چوالیس صفحات پر مشتمل اس کتابچے میں یقین ظاہر کیا گیا ہے اسلام کی تمام تعلیمات کو بلا تکلف مذکورہ چار خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ اس کتابچے کے دیباچے میں موصوف لکھتے ہیں کہ:

"میں نے اس مضمون کی بنیاد ماں کی مامتا پر رکھی ہے۔ حقا کہ اللہ تعالیٰ کو بندے کے ساتھ ماں سے زیادہ محبت ہے۔ ماں کی طرح بندہ کی عزت ان کو مقصود ہے۔ راحت، فرحت، جمال اسی کے مزینات ہیں۔ عزت کی اصل غیرت ہے اور غیرت کی اصل توحید۔ یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ غیرت توحید کی جڑ ہے، جس طرح کبر، کفر کی۔" (صفحہ 4)

اسلام کے چار عناصر کی اشاعت ریاض (سعودی عرب) میں ہوئی تھی اور اس کا سہرا آپ کے دوست الحاج محمد جلیل فضل کریم کے سر جاتا ہے، جن کے بارے میں پیش لفظ میں لکھا ہے کہ:

"میری بہت سی قلمی کاوشوں کی طرح یہ مضمون بھی کہیں مدفون ہو جاتا مگر میرے مشفق و محترم بھائی محمد جلیل صاحب اور قابل احترام بزرگ قاری عبدالماجد محمد ذاکر صاحب کے اصرار بے حد نے اس کے ظہور کی شکل پیدا کر دی۔ اب آرزو ہے کہ اس کے ذریعہ ہم میں تعلق مع اللہ پیدا ہو اور جذبہ غیرت ایسا زندہ ہو کہ ہماری بگڑی بن جائے۔"

اس کتابچے کا تعارف کراتے ہوئے لکھتے ہیں کہ۔

"زمانہ طالب علمی میں 'محاسن اسلام' پر ایک مضمون لکھا تھا، زیر عنوان یہ مصرعہ

پہلے تھا صد بزرگ یہ گل اب ہزارہ ہو گیا

اشارہ اس طرف تھا کہ علوم جدیدہ نے اسلام کی خوبیوں کو چار چاند لگا دیئے ہیں، مگر استاد گرامی ڈاکٹر سید عابد حسین صاحب نے فرمایا کہ اسلام تو وہی ہے جو پہلے تھا۔ نہ گھٹ سکتا ہے اور نہ بڑھ سکتا ہے۔ اسی لئے یہ مصرعہ موضوع نہیں رہا۔ استاد سامی مولانا شرف الدین یاس نے فرمایا کہ "موزوں نہیں موزوں ترین ہے۔" پہلے اسی پھول کو صد برگ کہتے تھے، اکبر نے اس کا نام ہزارہ رکھا۔ مسمّی ایک ہے، نام دو ہو گئے۔ اب مجھے اس کے برعکس صورت درپیش ہے۔ اس زمانے میں جب کہ عناصر کی تعداد سینکڑوں تک پہنچ گئی ہے، عناصر اربعہ قدیم، آب، باد، آتش و خاک کی طرف واپس جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ تمام تعلیمات اسلامیہ کو بلا تکلف ان چار خانوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے۔ یہ رسالہ محض ایک اشارہ ہے اہل علم و فضل کے لئے، وہ اس پر دفتر کے دفتر لکھ سکتے ہیں۔ اس رسالے میں بہت سے نقائص بھی ہیں، وہ میری ذات کے نقائص ہیں۔ اطمینان یہ ہے کہ اصل مقصد کو اہل نظر پا جائیں گے۔

"عناصر اربعہ قدیم، آب، باد، آتش و خاک" اس انتہائی اہم کتابچہ کا اختتام 'آخری

بات‘ کے عنوان سے ان الفاظ پر کیا ہے:

”ایک چیز ہے جس کا خیال رکھنا بہت ضروری ہے۔ وہ یہ کہ غیرت کا جذبہ بعض وقت متکبر اور مغرور بنا دیتا ہے۔ اگر ایسا ہوا تو ہم نے اسلام کو کفر سے بدل ڈالا۔ اللہ کی بجائے خود اپنی پوجا شروع کر دی۔ لیکن غیرت اور غرور کے ڈانڈے ملے ہوئے ہیں۔ اس کا علاج کیا ہے؟ اپنے آپ کو کسی کے ماتحت بنانا۔ صحابہ کرام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے غلام بن کر بادشاہ بنے تھے۔ اسلام میں انفرادی زندگی کا کوئی تصور موجود نہیں۔ ہر دم ایک امیر کا ہونا لازمی ہے۔ چاہے سفر ہی میں کیوں نہ ہو۔ یہی حد بندی ہے جو غیرت کو غرور سے روکتی ہے۔“

نیم کا درخت

بظاہر چوبیس صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ ایک مختصر بیانیہ ہے، لیکن اس میں مولانا محمد عبدالملک جامعی نے علم وفضل، فلسفہ اور منطق کے دریا بہا دیئے ہیں۔ اس کتابچہ کا مرکزی نکتہ نم کولی ہے، جو بظاہر ایک بے حیثیت شے ہے لیکن اس کی کوکھ سے کیا کچھ جنم لیتا ہے، اسے اس کتابچہ میں بڑے دل چسپ اور سبق آموز پیرائے میں بیان کیا گیا ہے۔ ”مضمون کی نم کولی“ کے عنوان سے اس کتابچے کا پس منظر بیان کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں کہ:

”پنجاب کے ایک صاحب مولانا الیاس صاحب کے یہاں مہمان آئے ہوئے تھے۔ دہلی نظام الدین میں کسی اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ تبلیغ کے بارے میں بہت سی باتیں ان کی سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں، جیسا کہ شروع میں ہر آدمی کو ہر کام میں پیش آتا ہے۔ انھوں نے ذاکر صاحب (ڈاکٹر ذاکر حسین) سے ایک سوال کیا: ”ڈاکٹر صاحب میری سمجھ میں نہیں آتا محض کلمہ کی تبلیغ سے کیا ہو جائے گا اور کچھ یہ لوگ کرتے نہیں۔“ ذاکر صاحب نے معصومانہ انداز میں جواب دیا: ”ہاں یہ تو میں بھی نہیں کہہ سکتا، مگر ایک بات ہے سامنے جو نیم کا درخت کھڑا ہے، یہ ایک چھوٹی سی نم کولی میں سے نکلا ہے۔“ میرا یہ مضمون ڈاکٹر صاحب کے اسی تاریخی فقرہ سے ہے۔ استاد گرامی اس زمانے میں ہمارے ادارے (جامعہ ملیہ) کے صدر تھے۔ اب سنا ہے کہ ہندوستان کی جمہوریت کے صدر ہیں۔

یہ کتابچہ مولانا محمد عبدالملک جامعی نے 1387 ہجری میں تحریر فرمایا تھا اور اس کا آغاز ان الفاظ سے کیا تھا:

”شمشیر اور تقدیر دونوں کا مذہب ایک ہے۔ تلوار کو اگر دشمن کے مقابلہ پر نہ چلاؤ تو دوستوں کو قتل کرنا شروع کر دیتی ہے۔ اسی طرح تقدیر کو اگر مقاصد وعزائم کی بلندیوں کے لئے استعمال نہ کرو تو انسان کو ذلت کے آخری گڑھے میں دھکیل دیتی ہے۔“

ظالم کون؟

ساٹھ صفحات پر مشتمل یہ کتابچہ 1405 ہجری مطابق 1985 میں منظر عام پر آیا تھا۔ دیگر قیمتی کتابچوں کی طرح یہ بھی موصوف کی گہری سوچ اور طویل غور وفکر کا نتیجہ ہے۔ اس کی اشاعت اگر چہ ہندوستان میں راقم نے کروائی تھی لیکن اس کی طابع و ناشر کے محمد علی اکادمی، مدینہ منورہ ہے۔ اس کا عنوان دراصل ذات باری جل جلالہ، عم نوالہ کی شان میں ایک بے ادب کے فقرہ پر محاکمہ اور اس کا معالجہ ہے۔ یہ کتابچہ 4 شوال 1403 میں مکمل کیا گیا تھا۔ اس مقالہ کی غرض وغایت پر اور تمہید بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں کہ:

”ایک مجلس میں بیٹھا ہوا تھا کہ ایک صاحب نے اپنے افسران بالا کی شکایت کرتے ہوئے کہا۔ ’نقل کفر، کفر نباشد‘ خدا ظالم ہے اور ظالموں کا ساتھ دیتا ہے۔“ معاذ اللہ، معاذ اللہ۔ معلوم ہے کہ دفاتر میں ماتحت ملازمین اور افسروں کے درمیان ایسے معاملات پیش آتے رہتے ہیں، جس کو آدمی ظلم و زیادتی جانتا ہے اور بعض اوقات یہ بات سچی بھی ہوتی ہے، لیکن اس ظلم کو براہ راست خدا تک پہنچا دینا کتنا بڑا ظلم ہے؟ یہ بات مجھے گوارا نہیں ہوئی اور میں نے متوکلاً علی اللہ قلم اٹھایا۔ اشہب قلم سرپٹ دوڑتا چلا گیا۔ شاید اس لئے کہ طبیعت میں برہمی زیادہ تھی۔ میں نے اس

مضمون میں قصداً 'آیات شریف' نقل نہیں کیا ہے جو بے شمار ہیں اور جن میں صراحت کے ساتھ بتایا گیا ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی ذات ظلم سے کس درجہ منزہ اور مبریٰ ہے۔"

کتاب کا آغاز اس شعر کے ساتھ ہوتا ہے

اچھا یقیں نہیں ہے تو کشتی ڈبو کے دیکھ
ایک تو ہی ناخدا نہیں ظالم، خدا بھی ہے

مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں

مولانا محمد عبدالملک جامعی کی یہ معرکۃ الآراء کتاب مولانا محمد علی جوہر سے ان کے تعلق کی ایک چشم کشا داستان ہے جس میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت اور افکار کا تعارف نہایت بلیغ انداز میں کرایا گیا ہے۔ یہ کتاب ذاتی مشاہدات پر مبنی ہے اور اس میں مولانا محمد علی جوہر کی شخصیت سے متعلق نہایت اہم باتیں منظر عام پر آئی ہیں۔ مولانا محمد علی کے قریبی عزیز ڈاکٹر ظہیر علی صدیقی کا بیان ہے کہ انھوں نے اب تک مولانا محمد علی پر جو سیکڑوں کتابیں پڑھی ہیں ان میں یہ کتاب سب سے منفرد اور یکتا ہے۔

مولانا محمد الیاس اور ان کی تبلیغی تحریک

اس کتاب میں موصوف نے تبلیغ کے ابتدائی زمانے میں پیش آئے انتہائی قیمتی تجربات کو بیان کیا ہے۔ ان واقعات کی خوبی یہ ہے کہ یہ تمام بانی تبلیغ مولانا محمد الیاس صاحب کے دور میں پیش آئے۔ یہ واقعات اپنی اصل کے اعتبار سے عجیب وغریب ایمانی کیفیت پیدا کرتے ہیں اور دعوت وتبلیغ کے عمل کو صحیح اصولوں کے ساتھ کرنے کی طرف رہنمائی کرتے ہیں۔ اس کتاب میں غیر مسلموں میں تبلیغ، عورتوں میں تبلیغ اور ملکی وغیر ملکی تبلیغی اسفار کی دلچسپ روداد بیان کی گئی ہے۔

یوں تو مولانا محمد عبدالملک جامعی کے مضامین اور مقالوں کی تعداد سینکڑوں میں ہے اور ان میں بیشتر غیر مطبوعہ مضامین ہیں جو راقم الحروف کے پاس محفوظ ہیں۔ مطبوعہ مضامین میں دو مضامین بہت زیادہ بحث کا موضوع بنے جو "تعمیر حیات" (لکھنؤ) میں شائع ہوئے تھے۔ ان میں پہلا مضمون دراصل چاند کے پہلے مسافر نیل آرم اسٹرانگ کے نام ایک کھلا خط تھا، جبکہ دوسرا مضمون ہمارے دستور ساز ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر کے نام تھا جس میں انھیں اسلام کی دعوت انتہائی موثر پیرائے میں دی گئی تھی۔

جناب عبدالمتین منیری کا خیال ہے کہ یہ اپنے موضوع پر سب سے معتبر مضمون ہے۔ اس موضوع پر موصوف نے ایک مستقل کتابچہ بھی "دعوت اسلام۔ تمام عالم کی حیات" تحریر کیا تھا جو مرادآباد میں ان کے سب سے قریبی دوست مولانا افتخار فریدی نے شائع کروایا تھا۔ مجاہد آزادی اور مبلغ مولانا افتخار فریدی ہندوستان میں ان کے سب سے قریبی دوستوں میں تھے اور ان کے ساتھ مستقل خط وکتابت تھی۔ اپنے مضامین اور کتابچے بھی وہ مولانا افتخار فریدی کی خدمت میں بغرض اشاعت روانہ کرتے تھے۔ ان سے مولانا محمد عبدالملک جامعی کی خط وکتابت اس قدر تھی کہ مولانا افتخار فریدی نے اسے "مکتوبات مولانا محمد عبدالملک جامعی" کے عنوان سے شائع کیا ہے۔ 89 صفحات کی اس مستقل کتاب میں درجنوں قیمتی مکتوبات ہیں اور ان میں غم دوراں کے تذکرے کے ساتھ ان کے نجی معاملات پر بھی روشنی پڑتی ہے۔

مولانا افتخار فریدی مرحوم کے علاوہ ہندوستان میں جن لوگوں سے مولانا عبدالملک جامعی کی خط و کتابت تھی، ان میں ندوۃ العلماء لکھنؤ کے مہتمم مولانا ابوالحسن علی ندوی (علی میاں) اور دارالمصنفین اعظم گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ "معارف" کے ایڈیٹر سید صباح الدین عبدالرحمن کے نام قابل ذکر ہیں۔ مولانا محمد عبدالملک جامعی کے نام بعض اہم شخصیات کے خطوط مدینہ منورہ میں ان کے ذخیرے سے برآمد ہوئے ہیں۔ ان میں بیگم محمد علی کے دو خطوط کے علاوہ بہار کے گورنر کی حیثیت سے ڈاکٹر ذاکر حسین کے دو خطوط، سعید انصاری اور پروفیسر مسعود حسین خاں وغیرہ کے خطوط شامل ہیں۔

(نوٹ: مضمون نگار مولانا محمد عبدالملک جامعی کے بھانجے اور معروف صحافی ہیں)

جو گزاری نہ جاسکی ہم سے
ہم نے وہ زندگی گزاری ہے

(جون ایلیا)

پرویز ملک زادہ
(لکھنؤ۔ہندوستان)

جون ایلیا کو سب سے پہلے میں نے 1986 کے بیادِ فیض کے مشاعرے میں ویڈیو کے ذریعے دیکھا اور سنا۔ اس مشاعرے کی نظامت میرے مرحوم والد نے کی تھی اور یہ مشاعرہ خلیجی ممالک کے کامیاب ترین پہلے مشاعرے میں تھا۔ جون ایلیا صاحب نے مشاعرہ لوٹ لیا۔ ان کے اشعار پر خوب داد ملی۔ مجھے ایسا محسوس ہوا کہ جون صاحب کچھ سرور میں بھی ہیں۔ کچھ دنوں کے بعد بحرین کے مشاعرے کی بھی ویڈیو آئی اور یہ مشاعرہ میں بغیر کسی تکلف کے کہہ سکتا ہوں کہ میرے سنے ہوئے اور دیکھے ہوئے مشاعروں میں سب سے کامیاب ترین مشاعرہ تھا۔ نظامت میرے مرحوم والد پروفیسر ملک زادہ منظور احمد نے کی اور موجود شعرا میں خمار صاحب، پروفیسر جگن ناتھ آزاد، احمد فراز، ڈاکٹر بشیر بدر، حمایت علی شاعر، جمیلہ بانو اور قرار نوری بھی تھے۔ میرے والد کی نظامت اس مشاعرے میں اپنے شباب پر تھی۔ جون ایلیا صاحب نے یہ مشاعرہ بھی لوٹ لیا اور ان دو مشاعروں کی ویڈیو دیکھ کر میں جون ایلیا صاحب کا فین ہو گیا۔

1993 میں اطہر نبی صاحب نے لکھنؤ میں ایک عالمی مشاعرہ کروایا، جس میں احمد فراز اور جون ایلیا نے بھی شرکت کی۔ جون ایلیا اس مشاعرے میں سپر فلاپ ہوئے۔ فلاپ ہی نہیں ہوئے بلکہ ان کی ہوٹنگ بھی ہوئی۔ انہوں نے ضرورت سے زیادہ شراب پی ہوئی تھی اور وہ شعر پڑھ نہیں پا رہے تھے۔ اسی زمانے میں عمر شریف کا مشہور ڈرامہ ”بکرا قسطوں پر“ بہت پاپولر ہو چکا تھا اور اس کے کردار نواب ٹن کی بھی شہرت ہو چکی تھی۔ جون صاحب جب پڑھنے آئے تو کچھ لڑکوں نے چلا کر کہا کہ یہ نواب ٹن ہیں۔ خیر، جون ایلیا اسٹیج سے اتر آئے۔ ہم لوگوں نے ان کو گھیر لیا اور ان سے باتیں کرنے لگے۔ جون صاحب بہت ناراض ہوئے اور کہنے لگے کہ لکھنؤ والوں نے ان کو ہُوٹ کر دیا ہے، اب وہ لکھنؤ کبھی نہیں آئیں گے۔ ان کے ساتھ ان کی بھانجی کے شوہر بھی تھے۔ جون صاحب اتنے نشے میں تھے کہ ان کو ہم لوگوں نے سہارا دے کر کار میں بٹھایا اور وہ چلے گئے۔ اسی مشاعرے میں احمد فراز صاحب نے اپنی مشہور غزل ”سنا ہے لوگ اسے آنکھ بھر کے دیکھتے ہیں“ سنائی اور مشاعرہ اپنے شباب پر پہنچ گیا۔ اتنی داد ملی کہ جو بتائی نہیں جاسکتی۔ یہ تھی میری جون ایلیا صاحب سے پہلی ملاقات...

1998 جون ایلیا صاحب ایک بار پھر لکھنؤ آئے اور اس بار تقریباً 15 دن لکھنؤ میں رہے۔ ان کا قیام اندرا نگر میں اپنی سگی بھانجی کے گھر پر تھا، جو میرے گھر سے قریب تھا۔ ایک صبح جب میں ٹہلنے کے لیے رنگ روڈ کے ایک بڑے پارک میں، جہاں میں روز جاتا تھا، گیا تو دیکھا کہ وہاں جون ایلیا صاحب بھی ٹہل رہے ہیں۔ ان کی بھانجی کا گھر وہاں سے قریب تھا۔ میں لپک کر جون ایلیا صاحب سے ملا اور اپنا تعارف کرایا۔ انہوں نے مجھے سینے سے لگا لیا اور کہا تم تو میرے بھتیجے ہو۔ بہت دیر تک جون صاحب سے باتیں ہوتی رہیں۔ جون صاحب کی شخصیت ایسی تھی کہ کچھ اور لوگ بھی آ گئے قریب میں

اور باتیں ہونے لگیں۔ جون صاحب نے جب یہ بتایا کہ ممتاز اداکارہ مینا کماری ان کے بھائی کی بیوی تھی تو لوگ زیادہ متاثر ہوئے۔

لگاتار کئی دنوں تک میری جون صاحب سے صبح ملاقات ہوتی اور خوب باتیں ہوتی۔ کچھ دنوں پہلے ہی ان کا زاہدہ حنا سے طلاق ہوا تھا۔ ایک دن جون صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ پرویز میری شادی لکھنؤ میں کرا دو، مجھے بیوی کی عادت پڑ چکی ہے اور اب میں بغیر بیوی کے نہیں رہ سکتا۔ اگر میری شادی ہو گئی تو میں یہیں رہ جاؤں گا۔ جون صاحب نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ میری شادی کے بعد تم شادی کرنا۔ مجھے ہنسی تو بہت آ رہی تھی لیکن میں اپنی ہنسی کو روکے ہوئے تھا۔

ان 15 دنوں کے درمیان میں جون صاحب کو لے کر لکھنؤ میں کئی جگہ گیا۔ سلمان عباسی صاحب کے گھر بھی ایک نشست میں نے ان سے کہہ کر آرگنائز کروائی، جس میں عرفان صدیقی صاحب، ملک زادہ صاحب اور نیر مسعود صاحب نے بھی شرکت کی۔ یہاں بھی جون صاحب نے خوب سنایا اور ہم سب کی فرمائش پر بھی غزلیں سنائیں۔

یہ وہ زمانہ تھا جب جون ایلیا کی عوامی شہرت بالکل زیرو تھی۔ ان کو وہی لوگ جانتے تھے جنھوں نے ان کے مشاعروں کے ویڈیوز سنے تھے یا ان کو پڑھا تھا، کتابوں اور رسائل میں۔ یہ بات میں ہندوستان کے تناظر میں کہہ رہا ہوں۔

اور پھر جون ایلیا صاحب واپس پاکستان چلے گئے... وہاں سے ان کے بارے میں جو خبریں ملی وہ بہت افسوس ناک تھی۔ وہ بیمار ہوئے، ہاسپٹلائز ہوئے اور اپنے بچوں کو یاد کرتے ہوئے ان کا انتقال ہوا... یہ 2001 یا 2002 کی بات ہے، شاید 2002 ہی میں ان کا انتقال ہوا...

اس وقت بھی ہندوستان میں جون ایلیا صاحب کی عوامی شہرت نہیں ہوئی تھی۔

جون ایلیا صاحب کے انتقال کے تقریباً 10 سال بعد سوشل میڈیا نے اپنے ہاتھ پاؤں نکالے اور جون ایلیا کا نام لوگوں تک پہنچا اور وہ سوشل میڈیا کے مقبول ترین شاعر ہو گئے۔ جگہ جگہ ان کے اشعار دکھائی دینے لگے۔

میں کبھی کبھی سوچتا ہوں کہ وہی لکھنؤ جہاں میں جون ایلیا کو رکشے پر لے کر ادھر اُدھر گھومتا تھا، اگر آج جون صاحب ہوتے اور لکھنؤ آتے تو ان کے چاہنے والے، جن کی تعداد ہزاروں میں ہوتی، ان کو گھیر لیتے۔ اسی لکھنؤ میں اب ایک جون ایلیا ٹی اسٹال بھی ہے۔

جون ایلیا کے اشعار سن کر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جیسے شاعر بات کر رہا ہے کسی سے....

بولتے کیوں نہیں میرے حق میں
آبلے پڑ گئے زبان میں کیا
مجھ کو تو کوئی ٹوکتا بھی نہیں
یہی ہوتا ہے خاندان میں کیا

بشیر بدر صاحب نے کسی زمانے میں ایک شعر کہا تھا:

سجھائی کچھ نہیں دیتا، شکستہ یادوں نے
کسی کا چہرہ کسی کے بدن میں جوڑ دیا

اب ذرا اسی خیال کو جون صاحب کے شعر میں دیکھیں:

کیا ستم ہے کہ اب تیری صورت
غور کرنے پہ یاد آتی ہے

یہ شعر بہت آگے نکل گیا ہے بشیر بدر صاحب کے شعر سے...

جون ایلیا صاحب کی نثر بھی بہت اچھی تھی۔ نثر اور اشعار میں گفتگو کرنے کا جو فن غالب نے شروع کیا تھا، وہ ہمارے دور میں جون ایلیا کے یہاں بہت نمایاں طور پر دکھائی دیتا ہے...

جون ایلیا صاحب کی شہرت میں لگاتار اضافہ ہوتا رہا۔ آج ہر جگہ ان کا ذکر ہے، ان کے اشعار سنے اور سنائے جا رہے ہیں...

کیا تھا عہد جب لمحوں میں ہم نے
تو ساری عمر ایفا کیوں کریں ہم

اس طرح کے اشعار کہنے والا اب کوئی دوسرا جون ایلیا نہیں ہے۔ آج ہندوستان اور پاکستان میں جون کی نقل کرنے والے، ان کی طرح لمبے بال رکھنے والے، ان کی طرح اشعار سنانے والے بھی کچھ لوگ آ گئے ہیں...

مگر وہ بات کہاں مولوی مدن کی سی۔

افسوس کہ جس شخصیت کے ساتھ میرے کئی دن گزرے، اس کے ساتھ میری کوئی تصویر نہیں ہے، اس لیے کہ وہ موبائل کا دور نہیں تھا...

میں خود کو خوش نصیب سمجھتا ہوں کہ اردو کے اس البیلے اور منفرد شاعر کو میں نے پڑھا بھی ہے، دیکھا بھی ہے اور سنا بھی ہے...

وہ ملے تو یہ پوچھنا ہے مجھے
اب بھی ہوں میں تیری امان میں کیا

سلیم ناصر

آواز، لہجے اور کردار کا وہ فنکار جو امر ہو گیا

شاہد نعیم
(جدہ۔ سعودی عرب)

پاکستانی ٹیلی وژن، فلم اور اسٹیج کی تاریخ میں کچھ نام ایسے ہیں جو صرف اداکار نہیں بلکہ ایک پورا عہد ہوئے ہیں۔ سلیم ناصر بھی انہی باکمال فنکاروں میں شامل تھے، جنہوں نے اپنے منفرد اندازِ اداکاری سے ناظرین کے دلوں میں مستقل جگہ بنائی۔

سلیم ناصر 15 نومبر 1944ء کو ناگپور (بھارت) میں پیدا ہوئے۔ قیامِ پاکستان کے بعد ان کا خاندان پاکستان منتقل ہو گیا۔ تعلیم مکمل کرنے کے بعد انہوں نے عملی زندگی کا آغاز کیا، مگر فن کی دنیا انہیں اپنی طرف کھینچ لائی۔

ان کے فنی سفر کا آغاز ریڈیو پاکستان سے ہوا، جہاں ان کی آواز، مکالمہ ادائیگی اور جذبات کی ترجمانی نے انہیں نمایاں کیا۔ ریڈیو نے ان کے اندر موجود فنکار کو نکھارا اور پھر یہی صلاحیتیں ٹیلی وژن اور فلم تک پہنچیں۔

1976ء میں انہوں نے فلم "زیب النساء" سے فلمی دنیا میں قدم رکھا، جس میں وحید مراد اور شمیم آرا جیسے بڑے فنکار بھی شامل تھے۔

سلیم ناصر نے پاکستان ٹیلی وژن کے کئی لازوال ڈراموں میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کے مشہور ڈراموں میں شامل ہیں:

ان کہی، آنگن ٹیڑھا، جانگلوس، آخری چٹان، دستک، زنجیر، بندش، جھوک سیال، پل، جزیرہ اور نشانِ حیدر۔

خصوصاً "آنگن ٹیڑھا" میں اکبر کے کردار اور "آخری چٹان" میں سلطان جلال الدین خوارزم شاہ کے کردار نے انہیں گھر گھر مقبول بنا دیا۔

فن کی خاص بات یہ تھی کہ سلیم ناصر کی سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ وہ کردار کو صرف ادا نہیں کرتے تھے بلکہ اسے جیتے تھے۔ ان کی آواز میں ٹھہراؤ، مکالمے میں وزن اور چہرے کے تاثرات میں گہرائی تھی۔ وہ مزاحیہ کردار کریں یا سنجیدہ، ہر کردار کو اپنی پہچان دے دیتے تھے۔

ان کی فنی خدمات کے اعتراف میں انہیں بعد از وفات صدارتی تمغۂ حسنِ کارکردگی سے نوازا گیا۔

سلیم ناصر سے میری ملاقات ابتدائی دنوں 1973 / 74 میں کراچی میں ہوتی رہی۔ جب کبھی وہ کسی اسٹیج ڈرامے میں اپنا رول ادا کرنے پہنچتے تھے میں اپنے بڑے بھائی جان امام خان کے ساتھ شوق سے پہنچ جایا کرتا تھا۔ مجھے آج بھی یاد ہے، جب میں ایک طالب علم اور نو آموز لکھاری تھا، تو سلیم ناصر صاحب سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ اُس وقت اندازہ نہ تھا کہ جن سے میں ملاقات کر رہا ہوں یہ شخص آنے والے وقت میں پاکستان کی فنکارانہ تاریخ کا ایک روشن باب بن جائے گا۔ 19 اکتوبر 1989ء کو سلیم ناصر اس دنیا سے رخصت ہو گئے، مگر ان کے کردار آج بھی زندہ ہیں۔

کتابوں کے جانثار
علم پیشہ اور کتاب ہتھیار ہے

محمد معین رضا رضوی
(ناسک، مہاراشٹر۔ ہندوستان)

دنیا میں بہت ساری چیزیں ایسی ہیں جن سے ہم کو کچھ نہ کچھ فائدہ ضرور ملتا ہے اور جن سے ہم کو بہت ساری معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ کتاب انہی میں ایک بہت اہم چیز ہے۔ اس کے بنا نہ ہم کچھ جان سکتے ہیں نہ پہچان سکتے ہیں۔ یقیناً ہمارے علم کا پورا دارو مدار اسی پر ہے۔ کتاب جو نہ صرف ہمیں علم سے مالا مال کرتی ہے بلکہ جب ہم اس کا مطالعہ کرتے ہیں تو وہ ہمیں اپنے قیمتی لفظوں سے بہت ساری باتیں سکھا دیتی ہے۔

کتابوں کو پڑھنے کے بعد آدمی جب کم پڑھے لکھے لوگوں کے روبرو ہوتا ہے تو اس کے نورِ علم سے باقی سب کے قلوب بھی منور و مجلی ہو جاتے ہیں۔

آپ سوچیں ہم اگر اسکولوں کالجوں میں یا اور کوئی تعلیم گاہوں پر جاتے ہیں تو ہمیں وہاں پر اسی چیز کی ضرورت ہوتی ہے جس کے بغیر جس مقصد سے گئے وہ مقصد پائے تکمیل تک نہیں پہنچتا۔

ڈاکٹر علامہ اقبال ضرب کلیم میں ان کی نظم طالب علم فرماتے ہیں:

تجھے کتاب سے ممکن نہیں فراغ کہ تو
کتاب خواں ہے مگر صاحب کتاب نہیں

اس شعر سے اندازہ ہو رہا ہے کہ انسان جب تک کتاب کی روح تک نہیں پہنچے گا اُسے حکمت وعلوم کے لعل و گہر حاصل نہیں ہو سکتے۔ اس لیے کتاب خوانی اُسے کرتے رہنا چاہئے۔

بزرگان دین اور محبت کتاب چند واقعات

امام ابو الفضل عبد الرحمن ابن احمد علیہ الرحمہ فرماتے ہیں، یہ اوراق یعنی کتابیں میری اولاد کے برابر ہے۔ امام ابن جوزی علیہ الرحمہ کے پاس دو گھر تھے ایک میں رہائش پذیر تھے اور دوسرا کرایہ پر دیا ہوا تھا پھر آپ نے دونوں کو بیچ کر کتب خرید لیے۔

شیخ احمد قاسم نے بازار میں کتاب بکتے دیکھی تو اپنے کپڑے بیچ کر کتاب خرید لی۔

حضرت امام مالک رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ”مجھ سے کتابوں کی صندوقیں ضائع ہوگئی ہیں جو مجھے اہل اموال سے زیادہ عزیز تھیں۔“ (کتابوں کے عاشق)

کتاب اور علم بہترین میراث ہیں کہ وہ وراثت ہے جس میں تفریق نہیں اور وہ خزانہ ہے جس پر زکوۃ واجب نہیں، کوئی حاسد حیلہ سازی کر کے چھین نہیں سکتا، کوئی چور چرا نہیں سکتا اور کوئی پڑوسی دعوی نہیں کر سکتا اور نہ کوئی جھگڑ کر کے اپنا حق جتا سکتا ہے۔ (عشاق الکتب ص:۵۶)

جیسا کہ مذکورہ بالا واقعہ سے اندازہ ہو گیا ہو گا کہ ہمارے اسلاف، علمائے کرام

نے کتابی محبت کو فروغ دینے میں یقیناً قابل قدر کارنامہ انجام دیا۔

ہر زمانے میں بہت ساری کتابیں لکھی گئیں، اب تک وہ سلسلہ جاری و ساری ہے ابھی وہ دور نہیں آیا کہ کتاب پڑھنے والے کم ہو گئے ہوں۔

جیسا کہ ایک کتاب میں درج ہے کتاب اپنے پڑھنے والے کو اصحابِ علم و فضل کی صف میں شامل کرتی ہے اور اپنے مصنف و مؤلف کو سب پر مقدم رکھتی ہے۔

مطالعہ کی اہمیت

اللہ تعالیٰ قرآن مجید فرقان حمید میں ارشاد فرماتا ہے:

فَلَوْلَا نَفَرَ مِنْ كُلِّ فِرْقَةٍ مِّنْهُمْ طَائِفَةٌ لِّيَتَفَقَّهُوا فِي الدِّينِ

(سورۃ التوبہ ۱۲۲)

ترجمہ: کیوں نہیں کہ ان کے ایک گروہ میں سے ایک جماعت نکلے گی دین کی سمجھ حاصل کرے۔

علامہ مولانا مفتی فیض احمد اویسی رضوی رحمۃ اللہ علیہ اس آیت کریمہ کے تحت فرماتے ہیں، اس آیت میں علم دین کے حصول کی نہ صرف ترغیب و تحریص (لالچ) دلاتی بلکہ اس کے سمجھنے کے لیے بھی ارشاد ہو رہا ہے اور مطالعہ کتب کے بغیر دین کی سمجھ خاک حاصل ہوگی۔ لامحالہ (یقیناً) اس سے کتب بینی کی تحریص (لالچ) و ترغیب بھی ہے۔

سرکار علیہ السلام نے ارشاد فرمایا ہے، علم کا ایک باب حاصل کرنا ۱۰۰ ارکعت پڑھنے سے بہتر ہے اور آگے ارشاد فرمایا علم کا ایک باب حاصل کرنا دنیا و مافیہا سے بہتر ہے۔ (تفسیر اویسی)

اسلاف کا ذوق مطالعہ اور کتابوں سے لگن

حضرت محمد عبداللہ ابن خشاب النحوی کے شاگرد کہتے ہیں: میں اپنے استاد کی عیادت کرنے گیا تو دیکھا کہ کتاب ان کے سینے پر تھی اور وہ مطالعے میں مگن تھے۔

ابوالعلاء حسن ابن احمد ابن سحل الہمزانی نے والد (انکے والد اپنے وقت کے بہت بڑے تاجر تھے) سے ملنے والی وراثت کو تحصیل علم میں خرچ کر دیا اور بغداد سے خراسان تک سفر میں کتابیں کاندھے پر اُٹھائے چلتے تھے۔

آپ کو مرنے کے بعد خواب میں دیکھا گیا کہ ایک ایسے شہر میں ہیں جس کی تمام دیوار میں کتابیں ہیں اور ان کے اردگرد کتب جمع ہے اور وہ مطالعہ میں مشغول ہیں۔

ان سے پوچھا گیا کہ یہ کتب کیسی ہے؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں نے اللہ تعالی سے دعا کی تھی کہ وہ مجھے مرنے کے بعد اسی کام میں مشغول رکھے جس کام کو دنیا میں کیا کرتا تھا تو اللہ تعالی نے مجھے یہ شرف عطا فرمایا۔ (کتابوں کے عاشق)

کتاب علم دین حاصل کرنے فائدہ اٹھانے کا بہت نفع بخش ذریعہ ہے، کتابیں وہ بہتا ہوا سمندر ہے جس میں انگنت علوم وفنون بہتے نظر آتے ہیں۔ جب کوئی صاحب علم کسی مسئلے میں الجھ جاتا ہے تو کتابوں کا ہی رخ کرتا ہے اور کتاب اُس کی عقد کشائی کرتی ہوئی نظر آتی ہے۔ جب وہ کتاب کے صفحات کا مطالعہ کرتا ہے تو کتاب اس کا ساتھ دے کر اس کی علمی پیاس بجھاتی ہے۔

آپ نے مذکورہ بالا بزرگان دین کے متعلق چند واقعات ملاحظہ کیے۔ آج دنیا میں جدید سہولیات کی وجہ سے کتابیں حاصل کرنا اور مطالعہ میں لانا کوئی مشکل کام نہیں بلکہ آسان ہو چکا ہے۔

اہل علم کی شان

لغت میں علم جہالت کی ضد ہے اور اس سے مراد کسی چیز کو اس کی اصل حقیقت پر مکمل طور پر پالینا ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے عقل انسانی کو سمجھنے کی قوت عطا کی ہے۔

ویسے ہی علم کو کتاب کے بغیر سمجھنا بہت مشکل کام ہے، خالق کل نے اشرف المخلوقات کو جہاں بڑی بڑی عظیم نعمتوں سے نوازا ہے اسی میں علم اپنا الگ مقام رکھتا ہے۔

علم کے حصول کی اور دیگر صورتیں بھی ہیں لیکن اصل معنوں میں اگر دیکھا جائے تو انسان کو علم حاصل کرنے میں کتابیں ہی اس کا ہتھیار ہوتی ہیں۔

ایک شخص کا واقعہ ہے کہ اس نے کتاب خریدی۔ اس سے کہا گیا آپ نے وہ چیز خریدی جس کا آپ کو علم نہیں ہے، اس نے کہا میں نے غیر معلوم چیز اسی لیے خریدی تا کہ میری معلومات میں اضافہ ہو جائے۔

ایک قاضی صاحب قرض کے بدلے کتب خریدتے تھے، ان سے اس بارے میں پوچھا گیا تو فرمایا: میں وہ شئے کیوں نہ خریدوں جن کی بدولت مجھے یہ مقام ملا ہے۔

پھر پوچھا گیا کہ تم اپنے مقام میں ترقی چاہتے ہو تو کہا، جتنا بڑا پیشہ ہوتا ہے اس کے لیے اس کے متعلق آلات کی ضرورت بھی اتنی زیادہ پڑتی ہے۔ (تقیید العلم ص: ۱۳۷)

دیکھا آپ نے کہ اس شخص نے کتاب سے پیار محبت کا پورا حق ادا کیا اور کتاب کی عزت کو دوبالا کیا۔ اس واقعہ سے یہ پتہ چلا کہ علم پیشہ اور کتاب ہتھیار ہے۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ ہم کو ہمارے اسلاف، بزرگان، دین علمائے کرام کے نقش قدم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے، اور جیسے ان کو کتاب سے محبت تھی ہم کو بھی کتابوں سے ویسی ہی محبت کرنے کی توفیق رفیق عطا فرمائے، ان کے مطالعہ کے صدقے ہم کو بھی کتاب کا مطالعہ سوچ سمجھ کر کرنے کی قوت بخشے۔

آمین یارب العالمین۔

سیف ہو اِک ہاتھ میں اِک ہاتھ میں کاغذ قلم
دُور ہوں تعلیم سے اس قوم کے درد و الم

قلم قافلہ

نام:
شمس الدین

قلمی نام:
شمس الدین حامد ناگپوری

- میری پیدائش 30 اپریل 1952 کو شہر ناگپور میں ہوئی۔ ابتدائی اور اعلیٰ تعلیم بھی اسی علمی و تہذیبی ماحول میں حاصل کی۔ میں نے B.Sc (M.A (Public Administration اور اسی مضمون میں Ph.D کی ڈگری حاصل کی۔ اس کے ساتھ ساتھ طب متبادل کے مختلف شعبوں میں بھی تعلیم حاصل کی، جن میں BAMS (AM)، BCHMS (Compound Homeopathy)، N.D. (Naturopathy) اور Diploma in Acupuncture شامل ہیں۔

- میرے والد محترم جناب شارق جمال ناگپوری مرحوم اردو ادب کے ممتاز استاد شاعر تھے۔ علم عروض کے میدان میں انہوں نے نمایاں خدمات انجام دیں اور اردو شاعری میں کئی نئی بحریں متعارف کرا کے اپنی ایک منفرد شناخت قائم کی۔

- ادب و شاعری کا ذوق مجھے وراثت میں ملا۔ میں نے سن 1976 میں والد محترم کی نگرانی اور رہنمائی میں باقاعدہ طور پر شعر و سخن کی دنیا میں قدم رکھا اور علم عروض و فنِ شاعری کی تربیت حاصل کی۔ فی الوقت میرا مجموعۂ کلام زیرِ ترتیب ہے۔

- پیشہ ورانہ اعتبار سے میں گزشتہ اکیاون برس سے فارماسیوٹیکل فیلڈ سے وابستہ ہوں۔ اس عرصے میں بالخصوص Allopathic اور Nutraceutical شعبوں میں تحقیق و ترقی (Research) (Development) کی سرگرمیوں سے وابستہ رہا ہوں اور یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔ اس کے علاوہ طب متبادل کے مختلف طریقہ علاج میں جز وقتی پریکٹس بھی کرتا ہوں۔

- مصروف پیشہ ورانہ زندگی کے باوجود جب بھی فرصت کے لمحات میسر آتے ہیں تو دل دوبارہ وادیٔ شعر و سخن کی طرف مائل ہو جاتا ہے، جہاں لفظوں کی حرمت، فکر کی تازگی اور روایت کی روشنی میں اپنے جذبات و خیالات کو شعری قالب میں ڈھالنے کی کوشش کرتا ہوں۔

تعلیمی قابلیت

- B.Sc
- M.A (Public Administration)
- Ph.D (Public Administration)
- BAMS (AM)
- BCHMS (Compound Homeopathy)
- N.D. (Naturopathy)
- Diploma in Acupuncture

پیشہ ورانہ وابستگی

گزشتہ 51 برس سے فارماسیوٹیکل فیلڈ سے وابستہ، خصوصاً Allopathic اور Nutraceutical شعبوں Research & Development کی سرگرمیوں سے وابستہ۔

سانحۂ انتقال

ابو چل بسے

یہ اطلاع مجھے میرے واٹس اپ پر سید محمد یاسین ندیم صاحب کی بیٹی نے دی۔ ندیم صاحب، سابق کونسل جنرل ھند، ہفتہ بھر کی علالت کے بعد ۱۸ اگست کو دار البقا چلے گئے۔

خوبیوں کے مالک ندیم صاحب سے میرے تعلقات ۱۹۷۷ سے رہے ہیں۔ باغ و بہار شخصیت ہونے کے ساتھ ساتھ وہ منتظم، تاریخ و ادب کے شائق تھے اور ایک خوش الحان علم دوست بھی۔ اساتذہ کا کلام بہترین ترنم میں پڑھتے تھے۔ انہیں بیت بازی کی محفلیں آراستہ کرنے میں ملکہ تھا۔

ندیم صاحب ایک خود اعتماد سرکاری افسر ہونے کے ساتھ ساتھ ایک سفارتکار بھی تھے۔ ملازمت کے دوران وزارت خارجیہ میں اعلی و ذمہ دار عہدوں پر فائز رہے بشمول ڈائرکٹر، مکتب وزیر اعظم (Director, Prime Minister's Office)۔ حج کے امور پر انھیں دسترس تھی اور وہ حج کمیٹی آف انڈیا کے چیف ایگزیکٹیو افسر بھی رہے۔ ترقی کے مدارج طے کرتے کرتے حکومت ہند کی وزارت الداخلیہ میں جوائنٹ سکریٹری کے عہدے سے سبکدوش ہونے کے بعد وہ سماجی و فلاحی کاموں میں سرگرم رہے۔ کل ھند مسلم مجلس مشاورت کی مرکزی کمیٹی کے رکن بھی رہے۔

اللہ مرحوم کی مغفرت فرمائے، درجات سے نوازے، جنت کا مکیں بنائے۔ آمین

مرزا محمد نواب

(جدہ)

بانو سرتاج گذر گئیں

بانو سرتاج گذشتہ ماہ کی ۱۴ تاریخ کو انتقال کر گئیں۔ وہ 17 جولائی 1945ء کو پانڈھر کوڑا، ایوت محل ضلع، مہاراشٹر میں پیدا ہوئیں تھیں۔ وہ ایک پیشے سے معلمہ تھیں اور مختلف اداروں سے منسلک رہیں۔ وہ سابق پروفیسر و صدر شعبہ شری سائی بابا گروپ آف ایجوکیشن، گڑچرولی اور چندرپور، سابق پرنسپل، جنتا کالج آف ایجوکیشن، چندرپور رہیں۔

ابتدا میں مہاراشٹر کے ادبی اعتبار سے بنجر علاقے چندرپور سے مرحومہ کا رہائشی تعلق رہا۔ برسوں یہیں سے موصوفہ نے اپنا تحریری سفر جاری رکھا۔ کچھ عرصہ قبل وہ ایوت محل (مہاراشٹر) منتقل ہوئیں اور یہیں آخری سانسیں لیں۔ ایک بے حد فعال ادیبہ تھیں اور بچوں کا ادب، ڈرامے، افسانے کے لئے مشہور تھیں۔ نثر کی کئی اصناف میں طبع آزمائی کی۔ اللہ مغفرت کرے۔ انکی اکثر تصنیفات ریختہ پر موجود ہیں۔

(ادارہ)

آپ کے خطوط

آزادی نمبر۔۔۔ایک دستاویز

(۱)

میگزین دیکھ کر دل خوش ہوگیا- اداریہ سے لے کر آخری صفحہ تک آزادی کے رنگ بکھرے ہوئے ہیں - اور ڈاک ٹکٹ تو حیران کئے دیتے ہیں-کیا ہی خوبصورت کلیکشن ہے-ماشاءاللہ بہت محنت اور عرق ریزی سے میگزین کی ذمہ داری نبھارہے ہیں آپ لوگ-بہت مبارک- سلامت رہیں اورڈھیر ساری مبارکباد قبول کریں!

ڈاکٹر رفیعہ نوشین

(حیدرآباد،ہندوستان)

(۲)

پندرہ روزہ اُردو گلبن ’’آزادی ہند نمبر‘‘ موصول ہوا۔ ماشاءاللہ معلومات افزا اور دیدہ زیب جریدہ ہے،بالخصوص ڈاک ٹکٹس کے انتخاب نے متعدد اورگم نام مجاہدین آزادی اور معماران وطن سے متعارف کرایا۔

مشمولہ مضامین،منظومات اور کہانی و دیگر تخلیقات بے حد پسند آئیں۔

اللہ پاک سے دعا ہے کہ اُردو گلبن اسی طرح ترقیات کی منازل طے کرتا رہے۔آمین

عمران عاکف خان

(راجستھان،ہندستان)

(۳)

گلبن کا آزادی نمبر نظر نواز ہوا۔اس کا سرورق ملک کے رنگ برنگے ثقافتی منظرنامے کی بھرپور عکاسی کررہا ہے۔

نظم ونثر کا آپ نے قابل ستائش انتخاب کیا ہے۔

تمام مضامین عہد ماضی کی سیر کراتے ہیں یہ رسالہ نہیں بلکہ آنے والی نسل کے لئے اک دستاویز رہے گا۔

آپ داد کے مستحق ہیں کہ برصغیر کے نامور اہل قلم کو آپ نے یکجا کردیا ہے۔

میری نظم،’’اے زمین وطن‘‘ کی اشاعت کا شکریہ۔اک اہم دستاویز پر مبارکباد

دعا گو

شجاع الدین شاہد

(ممبئی،ہندوستان)

(۴)

اُردو گلبن کا آزادئ ہند نمبر بہت خوب ہے۔

تحریک آزادی کے اہم پہلو جیسے ڈاک ٹکٹ،رسالے،مخصوص تحریکیں،نمائندہ مجاہدین پر بھرپور معلومات اور خوبصورت ترتیب کے ساتھ ایک یادگار مجلہ کی اشاعت قابل تعریف ہے۔

اللہ آپ کی محنت اور جستجو کو کامیابی سے ہم کنار کرے۔

مبارکباد اور نیک تمنائیں۔

پروفیسر آمنہ تحسین مانو

(حیدرآباد،ہندوستان)

(۵)

یوم آزادی کے موقع پر نہایت وقیع اور جامع نمبر پیش کرکے آپ نے کمال کر دکھایا۔ ماشاءاللہ بہت خوب۔کوزے میں دریا سمو دیا آپ نے۔۔بہت بہت مبارکباد پیش ہے محترم۔

ہمارا افسانچہ ’’قربانی‘‘ بھی آپ نے شامل شاعت فرمایا اس کے لئے بھی شکریہ۔اس پر مزید یہ احسان فرمایا کہ اس ناچیز کی خبر بھی نمایاں طور پر شایع فرمائی۔ احقر سراپا تشکر اور ممنون ہے۔

جزاک اللہ خیر محترم۔

ڈاکٹر اظہر حیات

(ناگپور،ہندوستان)

(۶)

بہت خوبصورت اور معیاری رسالہ ہے۔

نفیسہ سلطانہ انا

(بھوپال،ہندوستان)

(۷)

آزادئ ہند کے خاص نمبر میں اداریہ بہت اچھا تھا اور آزادئ ہند کے بارے میں بھی بہت اچھی آگاہی دی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ اس میگزین کو دن دونی اور رات چوگنی ترقی دے۔آمین ثم آمین۔

ارشد قدوائی

(جدہ،سعودی عرب)